مختصر کہانیوں کا مجموعہ

فلسطینی رنگ ٹونز

ڈاکٹر: سناء شعلان

(بنت نعیمہ)

ترجمہ

ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

فلسطینی رنگ ٹونز

Book Title: فلسطینی رنگ ٹونز
مترجم عن الأصل العربي (تقاسيم الفلسطيني)

First Edition: 2024

Author: Professor. Sanaa Shalan
(bint Na,imah)
ڈاکٹر: سناء شعلان (بنت نعیمہ)

Translated by: Lubna Farah
ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

Book type: story collection

Number of pages: 278

Filing number: (2024/7/4410)

Classification number: 813.9

ISBN: 978-9957-545-76-5

Descriptors: /Arabic Stories//Arabic Literature//Urdu Language//Translated Literature/

All rights reserved to the author: Professor. Sanaa Shalan (bint Na,imah)

Author's address: Professor. Sanaa Shalan
Jordan, Amman, Post code: 11942
P.O. Box: 1351
Mobile, WhatsApp and Viber: 00962795336609
selenapollo@hotmai.com
Facebook: Sanaa Shalan
Sanaa ShalanYoutube:

Publisher data: (TNOOR Cultural CenterAL)
Al tnoor Kulttuurinkeskus ry
Väinölänkatu 19 B 38
33500 Tampere
Finland
Hassan Abbas .Dakhel
altnoor62@gmail.com

Printing press: Al tnoor Kulttuurinkeskus ry
Press
Finland – Tampere – 33500

Design: Asma Jaradat - Asma Office for Design and Directing

- The author bears the full legal responsibility for the contents of this publication. This publication does not reflect the views of the National Library Department or any other government department.
- The primary indexing and classification data was prepared by the Department of National Library.
- All rights reserved to the author Professor. Sanaa Shalan (bint Na,imah) . No Part of this book may be reprinted, photocopied, translated or entered into a computer or translated into a disk without the permission of the author.

مختصر کہانیوں کا مجموعہ

فلسطینی رنگ ٹونز

ڈاکٹر: سناء شعلان (بنت نعیمہ)

ترجمہ: ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

پہلی اشاعت

2024

انڈیکس

لگن 11
تعارف مترجم 13
وطن کے نغمات
درخت 17
پاؤں 18
ہدف کا نشانہ 19
عصمت دری 20
چوکور 22
ماں 24
جھولنا 26
موذن 27
ہولوکاسٹ 28
معجزہ 30
اکڑ 32
تاریخوں 33
شادی کا جوڑا 34
قبر کھودنے والا 37
ٹرول 38
کنعانی 40
غدار 41
صبا کا دودھ 42
جنین 43
چھوڑ دو 45
معاوضہ 47
رٹنا 48
بانجھ پن 49
چرچ 50
دوائی 51
مرد 53
جدوجہد 54

خصوصی کیس..... 55
اس کی ماں کا بیٹا..... 56
ایک مسکراہٹ..... 58
پہاڑ..... 59
دھوکہ..... 60
تقریر..... 62
پودے لگانا..... 64
الزائمر..... 65
عید کی پتلون..... 66
منع کرنا..... 68
زیتون..... 70
درخت..... 71
نومولود..... 72
بہرا پن..... 73
ماہی گیری..... 74
لیڈر..... 76
ابتدائی طبی امداد..... 78
بھائیو..... 79
اس کا باپ..... 80
شجرہ نسب..... 82
شہید..... 83
جل پری..... 85
دیوار..... 87
توہم پرست..... 88
لڑکی..... 89
ہانپنا..... 90
سکول..... 92
چہرہ..... 94
سرنگ..... 95
سونا..... 96
تحفہ..... 97
فرار..... 98

قبرستان 100
صحافی 102
دوست 104
الکُوفیّۃ 105
کراسنگ 107
ایک پیشکش..... 108
صحرا 109
پینٹنگز گیلری..... 110
گھر 111
ایک جملہ..... 112
مسجد 113
یکجہتی..... 114
پردہ..... 115
امید 116
کالا سمندر..... 117
شوق..... 118
سرپرست 119
95کلومیٹر کے لیے ایک فلسطینی جمہوریہ..... 120
سایہ..... 124
عید..... 127
امیدیں 128
شیر خوار قیدی..... 129
ہڑتال 131
نظم 133
آنسو 135
قیدی 136
دودھ..... 137
قیدی 139
عید میلاد..... 141
ننگا 142
دل..... 144
سپرم..... 146

اسیر کے نغمات

کیمپ ڈویژن 151
تھیم ہل 152
حنظلہ 154
تصویر 155
چکن 157
دوڑنا 158
میٹھا 160
عائشہ علوان 162
فلسطینی 164
فخر 165
کیمپ 166
کارڈ کی فراہمی 168
سزا 170
لوازمات 172
بھی 173
نہر البرید 175

خانہ بدوش کے نغمات

رہائش 179
سمندر 181
تھپڑ 183
مچھلی 184
تبادلہ 185
سفید جوتے 186
کرایہ پر لینا 187
ابن شہید 189
خیمہ 190
فلاسک 191
بوڑھا ہونا 192
آواز 194
خوش قسمت لڑکا 195
ایک لائن 196

خواہشات کے پیغامات 198
ایئر لائن 199
ٹرینیں 200
دوپہر کا کھانا 201
مشکل پیدائش 203
موت 204
ہار 205
ہوائی اڈہ 206

عرب کے نغمات

مونسٹر 211
دعم 213
خون 214
نیا نصاب 215
صیہونی 216
عربیت 219
ایک سپاہی 221
مظاہرہ 222
دیر 223
عدو کے نغمات 225
چور کی بیوی 227
خاموشی 229
عربی گانا 230
کوڑا 232
لباس 234
چور 236
رحم 237
چال بازی 239
آدمی 240
آر پی جی 242
شیرون 244
غلام 245
کتاب 246

میوزیم..... 247
شوق 248
بیج 249
افسانہ..... 250
بھولنے کی بیماری..... 252
خوشبودار پودا 253
طالب علم..... 255
أوزون..... 257

پردیسی کے نغمات

بت 261
ہوا اور کتے..... 262
درانتی..... 263
ویہم..... 264
قیامت..... 265
دو فٹ 269
خیالی فلم..... 270

لگن

میری مرحوم فلسطینی والدہ (بنت نعیمة) کو، جو میرے دل کا لازوال سرمایہ ہے، جس نے مجھے صبر، استقامت، ایثار اور ہمت کے معنی سکھائے اور میرے دل میں اپنے وطن فلسطین کی محبت کا بیج ڈالا.

اس کی پاکیزہ روح پر الفاتحہ

تعارف مترجم

فلسطین اس وقت دنیا میں واحد جگہ ہے جہاں انسانی زندگی پستول کی گولی سے بھی ارزاں ہے۔ اکیسویں صدی کی تہذیب یافتہ دنیا میں ایک چھوٹا سا ملک ظلم کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے جو اس سے پہلے ہٹلر نے ان کے لکھی تھی۔ لیکن انہوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ عمومی طور پر حالات کی سنگینی کا اندازہ اس موضوع سے متعلق امیجز اور سیمیاتی حوالوں سے کرتے ہیں ۔ جو متون اس وقت اس طرح کے موضوعات کے بارے میں تحریر کیے جارہے ہیں وہ بھی ایک فاصلے سے اور تخیل کی بنا پر کشید کیے گئے ہیں تاہم درد کی شدت زخم سہنے والے اور زخم کی زبان سمجھنے والے سے بہتر کوئی نہیں جانتا ۔ ہماری خوش بختی کہ پروفیسر ڈاکٹر لبنیٰ فرح جیسے عربی النسل دانش ور اور مترجم ہمارے ملک میں موجود ہیں جو شادی کے بعد پاکستان میں ہی مقیم ہوگئیں اور بطور عربی اردو مترجم نہ صرف شعبہِ تدریس سے منسلک ہیں بلکہ اعلیٰ پائے کی انٹرپریٹر بھی ہیں ۔ زیر نظر کتاب فلسطین سے متعلق کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے جو یقیناً ہمیں درد کی اس شدت سے آگاہ کرے گا جس سے ہم فاصلے سے بغل گیر ہورہے ہیں۔سینکڑوں فلسطینی روزانہ کی بنیاد پر دنیا کی سب سےبڑی جہنم میں ہماری بے حسی پر آنسو بہاتے ہوئے جامِ شہادت نوش کررہے ہیں اور امتِ مسلمہ سمیت اس دنیا کا مجموعی سماجی اور علمی شعور گویا ہائی

برنیشن پر ہے۔ ایک اجتماعی بے حسی جس ہم سب کے مردہ ضمیروں کی نشان دہی کررہی ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے آپ خود اسی لوکیل کا حصہ محسوس کریں گے۔ وہی استعارے ، وہی کیفیت اور وہی درد۔ افسانے وطن کی تقسیم سے چند جملوں کی کاٹ ملاحظہ کیجیے جو یقیناً دل چیر دینے کے مترادف ہے۔ ۱۔ جنگ میں اس کے پائوں شہید ہوچکے تھے۔ ۲۔ اس کے جوتے اس کے سرہانے پڑے تھے اور پائوں کٹ جانے کے باعث عید کا یہ تحفہ اب بے کار تھا۔ ۳۔پوری دنیا نے شہدا کے نام نہ چاہتے ہوئے بھی درختوں پر کندہ کردیے تھے تاکہ تاریخ اس جرم کو فراموش نہ کرسکے۔ درد بھرے افسانوں میں خون سے لتھڑی کہانیاں نہ صرف اس وقت کی ضرورت ہیں بلکہ ان کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس ظلم کی کیفیت سے اگاہ ہو اپنے اپنے میدان میں اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کرے ۔ ڈاکٹر لبنیٰ فرح صاحبہ نے اس کتاب کو ترجمہ کرکے یقیناً اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن یہ فرضِ کفایہ نہیں ہم سب کا فرض ہے ہم اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب خریدیں اور ہر سطح پر اس کے متن کو ڈسکورس کا حصہ بنائیں تاکہ ہم سب ایک پرزور آواز بن کر صہیونی طاقت کو زعم خاک میں ملا دیں ۔ ان شا اللہ یہ کتاب بہت جلد آپ کے دل اور بیک شیلف میں جگہ بنائے گی ۔

ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

وطن کے نغمات

درخت

صیہونی حملہ آورفلسطینی دیہاتیوں پر حملے کے دوران، معصوم فلسطینیوں کو بے دریغ ذبح کرتے، بدسلوکی، عصمت دری، ذلیل ورسوا کرتے، لوٹ مارکرتے اورگولے بارود کی گھن گرج میں یہ کہتے پھررہے تھے کہ فلسطینی عوام ہی ہیں جنھوں نے ان پر حملہ کیا، ان کے فوجیوں کو قتل کیااورڈھول پیٹے اور جنگ کی۔

ساری دنیا نے ان جھوٹے، ظالم گروہوں پر یقین کیا اور انھیں ان ظالموں پر یقین کرنا تھا، حتیٰ کہ پھر انھوں نے اپنی مدد، ہمدردی ان کے لیے نچھاورکی۔ سردی، برف، ظلم اور ویرانی کے تاثر سے بھرپور صیہونی چہرے صرف زیتون، انجیر، نارنگی، انار اور انگور کے درختوں کو دیکھ کر خوشگوار ہوجاتے تھے۔ فلسطینیوں کو قتل کرنے، لوٹنے، عصمت دری کرنے اور ان کی سانسوں کو دبانے والے ظالم ہاتھوں سے سامنے آنے والے چہرے اپنے ظلم وبربریت سے زمین کو بھی تاخت وتاراج کردینا چاہتے ہیں۔دوردراز سے آئے ہوئے غاصب صیہونی قاتلوں کی خوشی سے یا نا چاہتے ہوئے بھی پوری دنیا نے تعریف کی جیسا کہ زیتون، انجیر، نارنگی، انار اور انگور کے درختوں کے تنے پر صالح شہداء کے نام کندہ کیے گئے تاکہ تاریخ اس جرم کو فراموش نہ کرے۔

پاؤں

جنگ میں اس کے پاؤں شہید ہو گئے تھے، اب جبکہ اس کا پورا خاندان ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز پر بیٹھ کر نماز کی اذان کا انتظار کر رہا تھا کہ صیہونی گولے نے انھیں کھا لیا۔ عید اس وقت آئی جب ہیبہ ہسپتال میں اپنے عزیز کے بغیراکیلی تھیں،جبکہ ہسپتال میں کچھ اساتذہ بھی تھے۔ انھوں نے چمڑے کے جو جوتے پہن رکھے تھے وہ ہیبہ کی اپنی جوتوں کی فیکٹری سے بھیجے گئے تھے۔ اس کا جوتا اس کے سرہانے کے پاس پڑا تھا اور پاؤں کٹ جانے کے باعث اب عید کا وہ تحفہ اس کے لیے قابل استعمال نہ تھاہسپتال میں موجود اس کے دوست ہیبہ کی فیکٹری سے تحفتاً آئے جوتے پہنے ہوئے احساسِ جرم میں مبتلا تھے وہ تو ادھر ادھر چل پھررہے تھے مگر ہیبہ چلنے سے محروم بے بس ہوچکی تھی۔ عید کے دوسرے دن سب لوگ ننگے پاؤں اور نئے جوتوں کے بغیر اس سے ملنے آئے وہ اس کی غمگین عید پر احساسِ ہمدردی سے محروم تھے۔

ہدف کا نشانہ

اسے فٹ بال کھیلنا پسند نہیں، لیکن وہ اپنے بھائیوں، کزنوں اور دوستوں کو قدیم مکانات اور تہہ خانوں کے پیچھے چھپے پرانے شہر کے ایک چھوٹے سے چوک میں کھیلتے دیکھ کر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔وہ اپنی ماں سے وعدہ کرکے گیا تھا کہ وہ غروب آفتاب کے وقت وہ گھر واپس آ جائے گا، لیکن سورج غروب ہونے سے پہلے اچانک اس جگہ پر گر پڑا اور وہ اپنی ماں سے کیے گئے وعدے کے باعث گھر کی طرف بھاگا، اور اندھیرا چھاجانے سے پہلے وہ اپنے گھر واپس پہنچ جانا چاہتا تھا۔مگر ساتھیوں، رشتہ داروں اور دوستوں نے اسے کھیل کے آخری دور کو ختم ہونے اور حتمی نتیجے کے مطابق فاتح کا تعین ہونے تک وہاں رکنے پر اسے مجبور کردیا۔

وہ پرامید تھا کہ آخری لمحات تیزی سے گزر جائیں گے وہ میچ کے آخری لمحات دیکھ پائے گاپھر وہ جلد ہی لوٹ جائے گا اوراس کی ماں ناراض نہیں ہوگی۔مگر مقررہ وقت تک پہنچنے میں اسے دیر ہوچکی تھی۔چند منٹ گزرے یہاں تک کہ صیہونی دشمن نے کھیل میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا، وہ بغیر اجازت کے کھیل میں داخل ہوگئے ایک نے میزائل چلا دیاجس سے میدان اجڑگیا اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ وہ نوجوان کھلاڑی جو اپنی ماؤں کو انتظار نہ کرنے دیتے تھے اس کے بعد اپنے گھروں کو واپس نہ لوٹیں گے۔

عصمت دری

صیہونیوں کے روایتی فیصلے کی وجہ سے فلسطین میں سہانے خواب وہاں کے لوگوں کے لیے حرام ہیں، لیکن اس کے باوجود، وہ نسوانی خواہشات کے لیے چھیڑ چھاڑ کرتی اور اپنے خوابوں پر یقین رکھتی ہے، اور اس وقت کے انتظار میں رہتی ہے کہ وہ سفید لباس پہن کر لمبے، خوبصورت بھورے رنگ کے مرد سے شادی کرے اورجب وہ اپنے گھر کے دروازے پر آٹا اور گلاب چسپاں کرنے کے لیے، وہ دلہن کے طور پر اس میں داخل ہوتواسے عبایا میں سجا کر اس کے گھر میں اس کی موجودگی کو ابدی، دوستانہ اور خوشنما بنائے کہ وہ لمحے امر ہوجائیں اس پر پھولوں کی بارش ہوجائے۔ عورتوں کی التجائیں، حسد کرنے والوں کی آنکھوں میں نمک چھڑکنے کے ساتھ اس کی ظاہری خوبصورتی مدھم تھی اور اس نے اس جانب توجہ نہیں دی تھی، لیکن اس کی روح کی خوبصورتی گویاروشنی کا مینار تھی، اور بہت کم لوگ اپنی آنکھوں سے اس کے اندر کی روشنیاں دیکھ سکتے تھے۔تب اپنے والد کے دفاع میں، جو اپنی سرزمین پر جا رہا تھا جب صہیونی غاصبوں نے اس پر حملہ کیا، وہ صہیونی جیل میں اس وقت قیدی بن گئی جب اس نے اپنے بزرگ باپ کو تھپڑ مارنے کی پاداش میں ایک پتھر سے کسی ظالم صیہونی کا سر کچل دیا۔

اب اسے اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں ہے، لیکن اسے اپنے ہونے والے شوہر کے تحفے پر دکھ ہے، جسے سپاہیوں نے بدلہ لینے

کے لیے جیل میں ضائع کر دیا، اس کا غرور توڑنے، اس کی عزت نفس کو خاک میں ملانے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس سے سب سے بھیانک بدلہ لیا گیا، مگرانھوں نے اس کی روشنی میں مزید اضافہ کر دیا، اب اسے یقین تھا کہ شوہر اور شادی کے خواب ہمیشہ کے لیے اس کی عصمت دری کے چولہے پر جل کر راکھ بن جائیں گے۔ وہ اپنے خواب اور کنوارے پن کے بغیر جیل سے چلی گئی، لیکن سات فلسطینی نوجوان ملے، جو اس کا انتظار کر رہے تھے،انہوں نے تلسی اور پودینہ جمع کرکے اس سے شادی کرنے کا مقابلہ کیا جس کی عصمت دری میں کمی نہیں آئی تھی جو اس کی عزت جیتنے کی خاطراس سے شادی کرنے کے لیے مقابلہ کر رہے تھے، جن کی عصمت دری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

چوکور

وہ چوگنی ہیں، اورقدرتی دیکھ بھال سے تراشی ہوئی ہیں وہ چار چھوٹی لڑکیاں ہوں گی جن کے چہرے فرشتہ ہیں۔ صحرائی گلاب کی طرح چمکدار بال اور صبح کی بارش میں رومی تالاب کے پانی کی طرح گھاس کی رنگت والی آنکھیں۔ وہ ہو بہوایک جیسی جڑواں ہیں، اور کوئی بھی انسان ان میں ایک دوسرے سے فرق نہیں کر سکتا، البتہ ان کی ماں (باصلاح) ہے جو ان میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کرتی ہے۔اور ہر ایک کو ایک مقررہ رنگ دیتی ہے کہ وہ اپنی بہنوں سے ممتاز رہیں۔

وہ انھیں اپنے لباس میں ان کے مخصوص رنگوں پر قائم رہنے پر مجبور کرتی ہے، لیکن وہ اب کی بار انھیں اس بات پر قائل کرنے سے قاصر تھی، کیونکہ ان چاروں نے ایک ہی رنگ کے ملتے جلتے کپڑے خریدنے کا تہیہ کر رکھا تھا، جو کہ سفید ہوں، اوروہ اپنے چچاابراہیم سے ملتے جلتے لباس پہنیں کیونکہ چچاکی شادی عید کے بعد ہو گی۔بچیوں کے بے لگام اصرار کے سامنے ان کی ماں کو ہتھیار ڈالنے پڑے، جنھیں وہ اس وقت تک برداشت نہیں کر سکتی تھیں جب تک کہ وہ اس خواہش کے حصول کے لیے اس کے خلاف اتحاد کر لیتیں۔

ماں نے انھیں وہ کپڑے خریدکردیے مگر انھوں نے وہ کپڑے اتارنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ وہ اپنے کپڑے پہن کر،

اپنے ساتھی پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے سامنے خوشی منانے کے بعد اپنے گھر لوٹنے کے لیے پرعزم تھیں، چنانچہ ماں نے دوبارہ ان کی اس خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور چلی گئی۔ انھیں کپڑے کی دکان میں سیلز وومن کے پاس بٹھادیاگیا جب تک کہ وہ قریبی بازار سے سبزیاں خرید کر واپس نہ آئیں اور وہ لوگ ایک ساتھ گھر پہنچیں لیکن اچانک ایک صیہونی گولہ کپڑوں کی منڈی پر گرا جس سے وہ ایک آگ میں تبدیل ہو گیا۔

بسیلہ حیرانی سے دوڑی دوڑی جھلسی ہوئی مارکیٹ کی طرف لوٹ گئی جو کہ چند منٹ پہلے ایک بھرپور بازار، لوگوں کے ہجوم اور سامان سے آباد حیثیت میں تھی۔ اس نے دائیں بائیں بکھرے ہوئے گوشت کو اٹھانا اور اسے اپنے سینے میں بھرنا شروع کر دیامگراب وہ اس قابل نہیں تھی۔اپنی زندگی میں پہلی بار۔ اپنے چوگڑوں میں فرق کرسکے۔

ماں

اگرچہ مدر خورہ نے اپنی زندگی میں ایک بھی بچے کو جنم نہیں دیاتھا لیکن اس کے باوجود وہ ان سب کی ماں تھیں۔ ہر کوئی اسے (مدر خدرہ) کہتا ہے، لوگ ان کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے، وہ مقبوضہ فلسطین میں قید تمام فلسطینیوں کی ماں ہے۔وہ قبضے کے حراستی مراکز میں بیٹھے ہوئے بیٹے کی ماں ہے جو جیل میں داخل ہوتے ہی بے ترتیب طور پر مارا پیٹا جاتا ہے، اس کے بچے ایک جیل سے دوسرے کیمپ میں جاتے ہیں، اس کے بچے اپنے لیے قیدی بچوں سے ملنے جاتے ہیں، اور اپنے ملک کے کٹے پھٹے قیدی بچوں کے لیے خصوصی تشویش ظاہر کرتے ہیں۔ اور اپنے اہل خانہ کے دفاع کے لیے فلسطین آنے کے بعد وہ اردنی کی ماں ہے جو اپنا سکول چھوڑ کر فلسطین کے دفاع کے لیے آئی تھی، اور وہ اس عراقی قیدی کی ماں ہے جس نے اس کے بعد مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کی قسم کھائی تھی کہ اس کی شرکت سے وہ آزاد ہو۔ وہ اس یمنی قیدی کی ماں ہے جو اپنے بیٹے کے ماموں کے اعزاز میں فلسطین کی آزادی میں حصہ لینے آئی تھی، وہ اس الجزائری قیدی کی ماں ہے جس نے اپنے باپ کی طرح فلسطین کو آزاد کرانے کی کوشش کی تھی اوردادا نے اپنے ملک کو الجزائر کے نوآبادیات سے آزاد کرانے کی کوشش کی، وہ مصری قیدی کی ماں ہے جو اپنی دلہن کو چھوڑ کر چلاگیا، اور وہ مسجداقصیٰ کے دفاع کے

لیے فلسطین آیا کیونکہ وہ اس کی سب سے خوبصورت دلہن ہے۔

وہ ماں بن کر قیدی بچوں کی جیلوں سے رہائی تک کے دن گنتی ہے، قیدیوں کے مقدمات کی پیروی کرنے والے وکلاء اور اداروں کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتی ہے، ہر وہ پیشرفت جو قیدیوں سے تعلق رکھتی ہے، ان کے اہل خانہ کو خط بھیجتی ہے اور اگر انھیں کوئی خط نہیں ملتا ہے تو وہ انہیں جعلی خط لکھتی ہے۔ فلسطین سے باہر ان کے اہل خانہ کی طرف سے کسی بھی ردعمل کا خیال رکھتی ہے۔ وہ مدر کھدرا تمام قیدیوں کی ماں ہے۔ وہ بازار میں تاجروں اور خریداروں سے لڑتی ہے، اور اپنی سبزیوں اور پھلوں کی قیمتوں کے بارے میں سودا کرنے سے انکار کرتی ہے کہ ان پیسوں کی مدد سے اس کے قیدی بچوں کی قید میں کمی آئے گی۔ ہر ایک کو وہ قیمت ادا کرنی چاہیے جو ماں کھدرا مانگتی ہیں، تاکہ وہ اپنے قیدی بچوں کو پیسے بھیج سکیں۔

جھولنا

وہ ہمیشہ اس جھولے کی طرف دیکھتی تھی جو ایک اشتعال انگیز لطافت کے ساتھ جھولتا تھا جب وہ اسے اشارہ کرتا تھا، جب وہ اپنے پیروں کے نیچے بچھی سبز گھاس کے تالاب میں غوطہ لگا رہی تھی، اور وہ اکثر صیہونی بستی کو گھیرے ہوئے خاردار تار کو پار [1]کرنا چاہتی تھی۔ اس خوبصورت جھولے پر خوشی کے ملے جلے احساس کے ساتھوہ سرخ چمڑی والی صیہونی لڑکی اپنا زیادہ تر وقت خوابوں کے جھولے پر کھیل کر گزار رہی تھی اور شاید اسے اپنے جیسے ساتھی کی ضرورت تھی کہ وہ بھی اس کے ساتھ تفریح اور کھیل کودمیں شامل ہو اور اپنے بچگانہ رازوں کواس کے ساتھ شیئر کرے، جو اس قدرخطرناک تھے، جتنا کہ وہ بتاتی۔ وہ خاردار تار کو پار کرنے کی ہمت کرتی ہے جو اس کے دور دراز فلسطینی گاؤں کو ویروولف کالونی سے الگ کرتی ہے، لیکن وہ اس تک نہیں پہنچ پاتی، اس پر کلہاڑیوں، چھریوں اور خنجروں سے حملہ ہوجاتا۔ [1]اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور اسے ایک معصوم فلسطینی بچہ ہونے کی سزا کے طور پر آگ کے شعلے میں جلا دیا جس نے ملعون سرخ چمڑے والے صہیونی بچے کے جھولے پر کھیلنے کا خواب دیکھا تھا۔

---

[1] کالونی تعمیر کے معنی رکھتی ہے لیکن صیہونی ادارہ کرائے کے صیہونی تارکین وطن کو رہائش دینے کے لئے فلسطین کی سرزمین پر جو تعمیر کرتا ہے۔

[2] وہ جاری رہتے ہیں کیونکہ وہ دوبارہ تعمیر نہیں کرتے بلکہ تباہ کرتے ہیں۔

موذن

برسوں کی معذوری، بیماری، بڑھاپے اور کمزور بینائی نے اسے دھیرے دھیرے گاڑی چلانے اور مسجد تک جانے سے نہیں روکا تاکہ وہ ہرروز پانچ وقت کی نماز کے لیے اذان دے سکے۔ اس نے چالیس سال تک بلاناغہ مسلسل اذان دی۔ ہیبرون شہر میں ہر کوئی اپنی آواز سے اذان کو یاد کرتا ہے۔

ایک دن صیہونی فوجی نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر واپس آجائے اور شہر میں نافذ جنگی کرفیو کی وجہ سے اذان نہ دی جائے۔ لیکن اس نے نماز کے لیے اذان ترک کرنے سے انکار کر دیا، چاہے اس کے لیے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

آخرکار مسجد کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر پرانے شہر کے فرش پر ایک صیہونی گولی نے اسے شہید کر دیا۔ صیہونی فوجیوں نے احتیاطی تدابیرکے طورپرکچھ وقت کے لیے اسے بے دردی سے ایک بکتر بند ٹریک پر گھسیٹا۔ لیکن اس کی روح نے اپنے مقررہ وقت پر اذان دینے کا عزم کر رکھا تھا اوروہ اس کے جسم سے نکل کر جلدی جلدی مینار کی طرف روانہ ہوئی اوراپنے وقت پر اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ہیبرون شہر، اپنے وجودکو الوداع کہتے ہوئے کہیں دورجاگرا اور ایک صیہونی کرالر میں ڈھیر ہوگیا۔

ہولوکاسٹ

بچے نے ان سب کو خاردارتار کے شمال میں اس بوڑھے فلسطینی کسان، اس کی بیوی اور اس کی چھوٹی سی پوتی پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ لیاتھا جو کہ بستی کو بوڑھے فلسطینی کے کھیت سے الگ کرتی ہے، حملہ آور کلہاڑیوں سے پھاڑتے ہوئے بیوی اور اس کی چھوٹی پوتی پراس وقت تک ظلم کرتے رہے جب تک کہ ایک کلہاڑی کسان کی بیوی کے جسم سے الگ نہ ہو گئی۔اس دوران ایک اور کلہاڑی فضا میں بلند ہوئی،اس نے اپنی چھوٹی پوتی کوتباہ کن ضرب سے بچانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جو اپنی دادی کے گلے لگی ہوئی تھی۔ صیہونی تخریب کاروں کی کلہاڑیاں پیچھے سے آکراس کے گوشت کوچھلنی کررہی تھیں۔

اس نے حملہ آوروں کو ٹھنڈے دل سے اور خوشی سے یہ کام کرتے دیکھا، اورنہتے انسانوں کو اذیت دینے کے مزے کے علاوہ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور پھر اس نے انھیں بزدلوں کی طرح کالونی میں واپس اپنے خیموں کی طرف جاتے دیکھا۔

بچے نے اپنے والدین کے چہرے پر حقیقی ناراضگی نہیں دیکھی حالانکہ وہ اسے حیرت اور ناپسندیدگی سے دیکھ رہے تھے اس دوران اس کی ماں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاکر معصوموں کے خون سے آلودہ کیا تھااوراس سے نفرت کرتے ہوئے اسے اپنی گود میں لے لیا، اوراس نے ایک ایسے انسان

کا نقاب پہنا جو اسے مناسب نہیں لگ رہا تھاوہ اس سے غصے سے بولا: "میری چھوٹی پیاری لیوی، تم جانتی ہو کہ ہم یہودی کمزور ہیں۔" اور ہمیں اپنا دفاع کرنا چاہیے۔" اس کے والد نے مزید کہا گویا وہ اپنی جعلی کتابوں میں سے ایک صفحہ پڑھ رہے تھے: "ہاں، جرمنی میں ہولوکاسٹ میں۔ ہم سب کو اس کا بدلہ لینا چاہیے۔" بچہ خاموش تھا، اور اپنے سفاک والدین کے چہروں کو گھورتا رہا، اور چپکے سے خدا سے دعا کرتا رہا کہ وہ اس کے سفاک والدین کو کسی بھی ہولوکاسٹ کے جہنم میں بھیج دے۔

معجزہ

وہ کبھی بھی معجزات پر یقین نہیں رکھتاخاص طورپر جب سے وہ موت کو معصوم چہروں پر تقسیم کرنے کا عادی ہو چکا ہے اور وہ اس سرزمین میں انقلاب اور صیہونی وجود کے خلاف جدوجہد سے گھبراتا ہے مگر کہہ سکتا ہے کہ اسے فلسطینی عوام کی زندگی، فتح اور آزادی پر اصرار ہے۔ اسی چیز نے اسے اس بین الاقوامی ادارے کے ذریعے آمادہ کیاکہ وہ سویڈن میں اپنی پرتعیش زندگی چھوڑدے، وہ اس جذبے کے تحت وہ ہسپتال میں موت اور درد کا سامنا کرنے کے لیے آتا ہے، جو کہ تعفن زدہ ہوچکا ہے۔ جیسے شیطانی روحوں کا شکار ایک لاوارث اسٹیشن۔ چالیس دنوں تک جب صیہونی بمباری نے نہتے فلسطینی شہریوں کومسلسل نشانہ بنایا،اس بربریت نے اسے انسانیت کے خلاف کفر کا درس دیا جو کرہِ ارض کے اس حصے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔اس نے آنکھیں چرا کر موت کو بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے آپ کو بے نقاب کرتے دیکھا۔ اور اس نے انسانوں کو بلا خوف و خطر اس کا سامنا کرتے دیکھا، اور اسے معلوم ہوا کہ موت ایک بزدل اور حقیر احساس ہے جو بے شرم چہروں کو اغوا کر لیتا ہے۔

جب سے بمباری کی چالیس ملعون راتیں شروع ہوئیں، وہ اس معجزے کومسلسل اپنی آنکھوں سے دیکھتارہاہے اور اس کا انکار کرتارہا، لیکن اب وہ اس پرمزید بے اعتنائی برداشت نہیں کر سکتاتھا، خواہ وہ معمولی سی ہی کیوں نہ ہوں۔ظلم وبربریت کا شکار نوجوان یا ان کے گھروں میں، پانچ یا چھ بچے، یہاں

تک کہ ایسی عورتیں جنھوں نے شادی نہیں کی یاانھیں کسی نے چھوا تک نہیں، ان کے رحم کو جنین کے ساتھ منتقل کیا گیا تھا جو پرتشدد،شرمناک حرکات کے ساتھ ان کی موجودگی کا اعلان کرتے تھے۔اس پر عجیب بوجھ ایک غیر فطری رفتار کے ساتھ بڑھتا ہے کہ تقریباً تمام جنین بچے بننے کے لیے رحم سے نکل جاتے ہیں، جدوجہد کی راہ کو جاری رکھنے کے لیے چپچپا دنیا میں پھسل جاتے ہیں، لیکن عجیب و غریب رحم سے آنے والے اس سے بھی زیادہ ہیں۔

ان کا ماننا ہے کہ معجزات کا وقت ختم ہو گیا ہے لیکن اب وہ مانتے ہیں کہ فلسطینی خاتون کا رحم ایک ایسا معجزہ ہے جو زندگی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ بمباری اور ہر طرف سے اس پر برسنے والے زخمی لوگوں کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جلد ہی حیرت انگیز بوجھ کے ساتھ خواتین کو جنم دینے کا عمل شروع کرنے کے لیے اورانھیں آرام مہیا کرنے کے لیے دنیا میں آنے والے فلسطینی بچوں کو حاصل کرنے والاوہ پہلا شخص بننا چاہتا ہے۔

اکڑ

اس کے بیٹے کو گم ہوئے تیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے، جب سے صیہونی غنڈوں نے فلسطین میں ان کے گاؤں پر چھاپہ مارااورگاؤں میں موجود ہر چیز کو لوٹ لیا، قتل و غارت گری،لوٹ کھسوٹ اور لوگوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا اورموت وحیات کے اس خوفناک کھیل میں اس کا چھوٹا بچہ اس سے بچھڑگیا۔ اس نے اپنی زندگی کے بقیہ تیس سال اسے پناہ گاہوں، ہسپتالوں، جیلوں اور قبروں میں ڈھونڈتے ہوئے گزارے، اس امید پر کہ وہ ان لوگوں میں سے کسی ایک کے چہرے میں چھپا ہوا اسے تلاش کرے گا، لیکن وہ اسے نہیں ملا۔

اس دوران اس نے فلسطین کے مخیرحضرات کے سامنیسرزمین فلسطین کے دفاع کے لیے اپنے سات شہید بیٹوں کی ماں کے طور پر پیش کیا اوراب وہ اپنے آٹھویں گمشدہ بیٹے کی تلاش میں تھی وہ بھی صرف اس لیے کہ اب وہ اپنے آپ کودفاع وطن کے لیے آٹھ شہید بیٹوں کی ماں کے طورپر پیش کرنے کے جذبے سے سرشار تھی۔ اس نے ہر اس چیز کی نذر مانی جوفلسطین کے بطن سے پھوٹی اب اسے اپنی مقدس نذر پوری کرنی ہے۔

تاریخوں

دادی اماں کے ذہن میں تمام واقعات فلسطینیوں کی مصیبتوں کے مطابق ترتیب دیے گئے ہیں، بچے اور پوتے پوتیاں اس کی المناک تاریخ کو ہیر پھیر کرنے کی کوشش کرتے اوراس کے لیے وہ اپنی آخری پوتی کی پیدائش کا واقعہ چنتے اور اس سے پوچھتے ہیں کہ یہ کب ہوا؟

وہ ان کے چہروں کو گھورتی ہے اوراس کی پیدائش سے متعلق کوئی فلسطینی واقعہ تلاش کرنے سے قاصر رہتی ہے، پھر دکھ اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے اور دکھ سے کہتی ہے: ”مجھے یاد ہے جب میرے بچے شہید ہوئے، اور تمہیں یاد رکھنا چاہیے۔ جب آپ کے بچے پیدا ہوں گے۔"

شادی کا جوڑا

اس کا عروسی لباس شکستہ حالت میں رکھا پڑا تھا،کبھی اپنے بستر پر، کبھی چمڑے کے پرانے تھیلے کے نیچے، جو اس کے کمرے میں الماری کے اوپر پڑا رہتا تھاوہ بوسیدہ ہو چکا تھا۔

اس نے اسے ایک سے زیادہ بار دھویا جب بھی وہ مٹی سے میلا ہوا اوربار بار ہاتھوں سے چھونے سے کبھی کبھار وہ اس پر سوبھی جاتی، اس کی خالص سفید خوبصورتی میں،خوش ہو کر، جب بھی وہ ناپ کرنے اسے اپنے اوپر سجاتی اور اپنے آپ کو آئینے کے سامنے کھڑا کرکے ضبط کرلیتی اور اسے اپنے دکھ کا کچھ مداوا محسوس ہوتا،وہ اکثر اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے اور پھٹے کونوں کے ساتھ اپنے طول بلد آئینے کے سامنے اس کی پیمائش کرتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔

کئی ماہ سے اس کی شادی کا لباس انتظار کر رہا ہے جبکہ اس کے پاس یا اس کی طرف سے کوئی اطمینان نہ ملتاتاکہ وہ اسکندریہ یا قاہرہ کے قریبی ہوائی اڈے تک پہنچنے کے لیے رفح کراسنگ کو عبور کرنے کے بعد عمل درآمد کی کوئی صورت نکل سکے اور وہ اپنے شوہر کے پاس پرواز کر سکے اور وہ دبئی کے اماراتی شہر کی طرف کوچ کرنے کے لیے پہلا ہوائی جہاز لے سکے، جہاں اس کا شوہر رہتا ہے اور

کام کرتا ہے، اور جہاں وہ برسوں پہلے اس سے پہلی بار اس وقت ملی تھی، جب وہ ایک یتیم بچے کے ساتھ وہاں مقیم تھی۔

اس کے شوہر کو اس قابل ہونے میں کئی مہینے لگے کہ وہ اپنے خاندان کو ہیبرون شہر سے غزہ کے بیچ کیمپ میں بھیجے تاکہ وہ اسے پرپوز کر سکے، اور پھر اپنے والد کو ایک سرکاری پاور آف اٹارنی کے ذریعے شادی کے طریقہ کار کو مکمل کرنے کے لیے یہ کام تفویض کرے۔

دادی اماں جن کا منجھلا بیٹا ظالم صیہونیوں کے ہاتھوں شہید ہوگیا، وہ افسردہ دکھی اور صوفیانہ ماحول میں رہنے لگی تھی۔اس عقیدت بھرے اور صوفیانہ ماحول سے باہر لانے کے لیے اس کے پوتے پوتیاں اس سے جنگ فلسطین کے حالات وواقعات کے بارے بات چھیڑ دیتے تھے تاکہ ان سانحات میں دادی اماں کوئی ایک آدھ سانحہ بیان کرسکیں۔ تب سے وہ رفح کراسنگ کے کھلنے کا انتظار کر رہی ہے تاکہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل سکے، لیکن یہ کراسنگ کافی عرصے سے مستقل طور پر بند ہے اور جتنی باربھی اسے کھولا گیا وہ اسے عبور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

اس نے اپنا عروسی جوڑا ایک سے زیادہ بار پہنا، اور اپنی باری کا انتظار کرتی رہی کہ وہ اپنے چمڑے کے تھیلے کے ساتھ کراسنگ بارڈرعبورکرے جس تھیلے میں اس کی شادی کی پتلون کا ڈھیر لگا ہوا تھا، لیکن ہر بار وہ اپنی خواہش کے باوجود اسے پار کرنے میں ناکام رہی، چنانچہ اپنے عروسی

لباس کی چیخوں کو سن کر ڈرتے ہوئے وہ اداس تلوار کی طرح پلٹ گئی، جس کا اس نے طویل عرصے سے خواب دیکھ رکھا تھا،یعنی جب سے اس نے شادی کی تھی اس کا یہ خواب پھانسی سجین کراسنگ تک روک کر ادھورا ہی رہنے دیا گیاجب تک کہ اس دروازے کو اس کے لیے کھولا نہیں جاتا۔

قبر کھودنے والا

وہ اپنے والد پر فخرکرتا ہے، جسے وہ صیہونی اپنادشمن (قبر کھودنے والا) کہتے ہیں، وہ ایک انجینئر ہے اوراگرمناسب مواقع دستیاب ہوتے تو وہ دنیا کے اہم ترین اسکالرز میں سے ایک ہو سکتا تھا، وہ اپنے صیہونی دشمن کے خلاف جاری جدوجہد کا پابند نہیں تھا۔

اس کے والد نے بہت ہی حساس ریموٹ بم دھماکے کے نظام کو ڈیزائن کیا تھا، اس نے اپنے دفترکے ہیڈکوارٹر پر دشمن کے ایک حملے میں اپنی ٹانگیں کھو دی تھیں۔ اس دن کے بعد سے، اس نے اپنے آپ کو یہودیوں کا قبرستان ثابت کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ ان کے لیے زیرزمین اسلحہ کے گھات لگاتا جو ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین کو جہنم میں بدل دیتا اورصیہونیوں کووہیں دفن کر دیتا ہے۔

وہ پُرعزم ہے کہ اس کے ساتھی اسے اپنے والدکے قابلِ فخر جانشین کے طور پر "سن آف دی گریویڈگر" کہہ کر پکاریں، اور جب بھی وہ اپنے دوستوں کواس لقب سے نوازتے ہوئے سنتا ہے، تو اسے یاد آتا ہے کہ وہ اپنے والد کو دیکھنے کے لیے کتنا بے چین ہے، جسے اس نے نہیں دیکھا۔ ایک سال سے زیادہ کے لئے. وہ صہیونی فوجیوں کے لیے قبریں کھودنے میں مصروف ہے۔

ٹرول

صلاح مرتے دم تک بونے جسم کے ساتھ پیدا ہوا تھا اس لیے لوگوں نے اسے بونا ہی کہا۔ اس نے اپنے بونے جسم کی وجہ سے کبھی توجہ، تعریف یا محبت حاصل نہیں کی جس میں اس کی دیو ہیکل روح قید تھی۔ اس کے دروازے پر دستک نہ دینے والی حقیر نگاہیں یا ان خوبصورت عورتوں کے دلوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ایک فلسطینی گوریلا کے طور پر زندہ رہا اور وہ ایک طویل عرصے تک جابرانہ جدوجہد کے بعد شہید ہو کر مر گیا۔ لیکن شہادت نے جلدی ہی اس کے دروازے پر دستک دی، اس کی روح نے شہادت کی آہٹ اس رات سنی جب وہ حساس صیہونی مقامات کے خلاف کمانڈو آپریشن کر رہے تھے۔ وہ مجاہدین کے اس گروپ کا رکن تھا جس کی سربراہی ان کے کارکن دوست (ابو النور) کر رہے تھے، کسی کو یہ توقع نہیں تھی کہ ایک اینٹی پرسنل بم اسے قتل کر دے گا، اور اس کی ٹانگیں ایک ہی دھماکے سے کٹ جائیں گی۔

اس کے ساتھیوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی، لیکن اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان میں سے کم از کم ایک کو ناکارہ کر دیا جائے یعنی اسے بروقت فرار ہونے سے روک دیا جائے اور اسے صیہونی دشمن کے فوجیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ کہ وہ اسے چھوڑ دیں اورباقی مجاہد کارکن اس کے بغیر بھاگنے میں جلدی کریں اورکہیں سے پناہ لیں، جب مجاہدین جلدی بھاگنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو اس نے دھمکی دی کہ اگر وہ اس سے جلدی نہ

نکلے تو اس سے پہلے کہ سپاہیوں کے کتے ان کے قریب پہنچ جائیں۔ انھوں نے آنسو بھری آنکھوں اور دل کے ساتھ اس کے حکم کی تعمیل کی اور وہ اپنی گولیوں سے ان کی پشت کی حفاظت کرتا رہا یہاں تک کہ اس کا گولہ بارود ختم ہوگیا اور صہیونی دشمن کی گولیاں اس کے جسم کو چھیدکر گئیں۔

گرفتار کیے جانے کے مہینوں بعدجب وہ اپنی زمین پر واپس آیاتواس کا جسم گولیوں سے چھلنی ایک چھوٹے سے دھڑ سے زیادہ کچھ نہیں تھا، جسے کتوں کے دانتوں سے نوچاگیا تھا، اور جسم سر اورایک ہاتھ پاؤں کے بغیر تھا، لیکن قربانی کے صلے میں اس کے ساتھیوں نے اسے ایک لمبی قبر میں دفن کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا جو اس کی دیو ہیکل روح سے ملتی جلتی تھی۔ زبردست روح کا حامل بھی وہی تھا۔

کنعانی

صیہونیوں نے اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی پر عمل کرنے سے روک دیاکیونکہ وہ لوگوں کو فلسطینی تاریخ پڑھا رہا تھا۔ ہوایوں کہ دشمن نے اس اسکول کو مسمار کر دیا جو اس کی خوشی کا مندر تھا، اور اس کے طالب علم (سعد) کو قتل کرنے کے بعد اسے بے گھر کر دیا۔ ایک کنعانی جو اپنی اصلیت پر فخر کرتے ہوئے صیہونیوں کو شیطان کہاکرتا تھا۔ وہ اس کا ذہین اور پسندیدہ طالب علم تھا، جس نے اسے سکھایا ہوا ہر لفظ یاد رکھا تھا، وہ فلسطینی تاریخ کی بنیاد میں اس کا قانونی وارث تھا۔

اس نے اپنے شہید طالب علموں کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اب اس کے لیے قلعوں اور محافظوں کو نظرانداز کرنے کی ضرورت تھی، تاہم اس نے اپنے آپ کو اچھی منصوبہ بندی اور مطالعہ کے لیے وقف کر دیا جب تک کہ وہ اور اس کی ٹیم ہدف تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اس نے کنعانی طالب علم کے چہرے کی طرح ان کو چھپ کر دیکھا،اسی لمحے اس نے ان کے ساتھ اس جگہ کو اڑا دیا، اور ان کا جسم بھسم کر دیا، جیسا کہ کنعانی کو محسوس ہوااس نے اپنے آپ کو آگ سے پاک کیاجو اس پر پڑی۔ اس نے ایک سکون کا سانس لیا اور دور سے ہی کنعانی کے چہرے کو دیکھا جب وہ کنعانی جادو کے ساتھ مسکرا رہا تھا، اس نے ہر غیر ملکی کو باہر نکال دیا۔

غدار

وہ نہیں جانتا کہ صیہونی فوج میں اس کا کمانڈر اس کو ناراض فلسطینیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کیوں مجبور کر رہا ہے کیونکہ اس کا کمانڈر اسے بتاتا ہے کہ فلسطینی نژاد ہونے کی وجہ سے وہ ایک بہتر مقام تک پہنچنے کے قابل ہے لیکن وہ گہرائی سے جانتا ہے کہ وہ اسے ان کے پاس بھیج رہے ہیں اور انھیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ جب تک وہ ان کے درمیان ہے اور ان کی جلد سے اس کی جڑیں چھین لی گئی ہیں، تب تک غصے میں آنے والے فلسطینی اسے ماردیتے ہیں۔

آج انھوں نے اس پہاڑ کے ساتھ فلسطینی زمین کو ضبط کر لیا جہاں اس کے خاندان کے گھر اور کھیت موجود تھے۔ وہ ہر اس پہلو کو جانتا تھا جس کا سامنا اسے ضبط شدہ زمینوں کو واپس کرنے کے لیے کرنا تھا۔ انھوں نے اسے اس طرح نظر انداز کیا جیسے وہ اسے جانتے ہی نہ ہوں، انہوں نے اس کا سر پتھر سے مارا تو وہ بے صبری سے وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ دوڑ رہا تھااور زمین پر ہلکے سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زمین نے بھی اُسے رد کر دیا ہے اور اُس سے انکار کر دیا ہے۔

صبا کا دودھ

اس نے شیر خوارگی میں دودھ اتنا بے باک ہونے کے لیے نہیں پیا تھا اس نے فلسطینی عورتوں کا دودھ پیا تھا۔ اس کی والدہ اس وقت شہید ہوگئیں جب وہ شیرخوار تھا، تو اس محلے کی عورتوں نے جس میں وہ رہتا تھا، اس کی دیکھ بھال کی اور اس پر شفقت کی بارش برسائی، اور وہ سب اسے دودھ پلانے اورپالنے پوسنے کی خوشی میں شریک ہوئیں یہاں تک کہ وہ مضبوط ناک والانوجوان بن گیا۔ محلے کی تمام عورتوں کو"اے ماں"کہتا تھا اور اس محلے کے لڑکے اور لڑکیاں اسے "بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔

اس نے ان سب سے ہمت سیکھی تھی اس نے ایک آر پی جی توپ اٹھائی اور فالکن بن کر صیہونی فوج کے پرندوں کا شکار کیا،اس کے نزدیک وہ سب پرندے تھے، جیسا کہ اس کی باز جیسی آنکھوں نے انہیں دیکھا۔ صیہونی فوجیوں نے اس کی تصویر شہر کے سامنے لٹکا دی تھی انھوں نے اسے دہشت زدہ کرنے اور اس کے حوصلے کو توڑنے کے لیے تصویرپرلکھا تھا: "یہ دہشت گرد اسرائیلی فوج کو مطلوب ہے، ہم اسے جلد ہی مار ڈالیں گے۔" دوسرے دن اس کی نئی تصویریں آر پی جی بندوق اٹھائے ہوئے نظرآئیں جو اس نے کل کی تصویروں کے اوپر چسپاں کی تھیں اور ان پر اہانت آمیز انداز میں اور اپنے دشمن کو اشتعال دلاتے ہوئے لکھا تھا: "یہ گوریلا پوری صیہونی فوج کو مار ڈالے گا، اور وہ سب اس کو مطلوب ہیں۔''

جنین

حنان صدر سے ماں کے پیٹ میں پھسلنے والا ننھا جنین نہ جانے کیوں ایک تیز دھار چاقو کی شفاف چاندی کی چادر سے کاٹ کر، ماں کے پیٹ کو پھاڑ کر اس کے چپچپا گرم رحم سے باہر پھسل کر بھوکا اور ننگا ہو گیا۔ کسی دائی، رشتہ دار یا دیکھ بھال کرنے والی عورت کے ہاتھ اس کے سر کے اوپر بغیر کسی وجہ کے گرنے سے پہلے اس کے چہرے کے بل گر گئے، جیسے اس کی ماں زمین کو چوم رہی ہو۔ ایک سفاک صیہونی فوجی نے اپنے عفریت کے چاقو سے اس کی دائیں چھاتی کو کاٹ کر جلدی سے ہانپتے ہوئے اس کے پیٹ کو اس کے رحم کی گہرائی سے نکال دیا۔

کسی کو اس کی پروانہیں تھی کہ اس کی مردہ ماں کا خون بہہ رہا تھاجب تک کہ اس کی پیشانی زمین کوباربار چھوتی رہی اور اس کی چھوٹی، نرم، ننگی گردن نے اس کی ماں کے قاتل کے چہرے کو چیلنج کیا، جہاں وہ ماہ اورجنین کی جدوجہد کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی رحم سے باہر سلائڈنگ۔

وہ صیہونی گوریلا سپاہیوں کے قدموں سے روند اگیا اور دنیا میں اس کی ایک ہی آخری بار عجلت بھری نظر تھی جو اس نے زمین پر اپنے جبری سجدے سے ڈالی، جب اس نے اپنے گاؤں کے لوگوں کو دور افق کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا، سفاک حملہ آوروں کی باقیات نے تعاقب کیا اور غروب آفتاب کے لمحے نے اس کے والد کو گلے لگا لیا، جو بیوی اور ان

کے پیدا ہونے والے بچے کے قتل کو دیکھ کر لمحوں میں دل موہ لینے کے بعد پاگل پن کا شکار ہو چکے تھے۔ بغیرتوقف کے"ظالموں نے میری بیوی (سوبیہ) کو مار ڈالا اور اس کا پیٹ کاٹ دیا۔''

جنین اپنے باپ سے مدد مانگنے کے لیے اپنے ہونٹ بند کرنے کی کوشش کرتا ہے جو غروب آفتاب کا پیچھا کر رہا ہے، دور دور تک بھاگ رہا ہے، لیکن موت اسے اس کے غم اور درد کے گھٹن سے نکال کر اور آنے والی جہنم سے اس پر رحم کر کے اسے تیز کر دیتی ہے۔ اسے اپنے وطن سے بے دخلی کہتے ہیں۔

چھوڑ دو

چونکہ ۱۹۴۸ میں بہت سے فلسطینیوں کو زبردستی ان کے وطن سے بے گھر کیا گیا تھا، لہٰذاوہ اپنے بچوں اور پوتوں سے کہہ رہا تھا: "میں اپنا وطن کبھی نہیں چھوڑوں گا، میں یہیں مروں گا، اور میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" اور وہ اکثر اسے دہراتے رہتے،ان کی دادی کہتی: "میں تمھارے دادا کے ساتھ مروں گی جہاں وہ مریں گے، اور میں انھیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔" پیار کرنے والے بوڑھے دادا دادی کی باتیں سن کر بچے اور پوتیاں ہنس پڑیں اور ان سے کہا کہ وہ اپنی محبت اور شادی کی کہانی دوبارہ سنائیں جو رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو معلوم تھی مگر وہ ان کی زمانی سسننے سے گریزاں تھے اور وہ اس میں جھانکنے سے گریزاں تھے۔ اس طرح کی گفتگو سے مایوسی کی وجہ ان کی زمین سے نقل مکانی کے امکان کے باعث تھی۔

بدقسمتی ان کا مقدر تھی اور ۷۶۹۱ء کا سال آیا،سب کچھ چھن جانے کے بعد وہ ہجرت پر مجبور کردیئے گئے، وہ اپنے پیچھے گھر، مویشی، پھلوں سے لدی زمینیں اور ڈھیروں کے ڈھیر چھوڑ گئے۔ ان کے مضبوط آدمی باری باری اپنے دادا دادی کا سہارا بنے، کیونکہ وہ بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے چلنے کے قابل نہیں تھے۔

دادا دادی نے اپنے وطن سے جانے سے انکار کر دیا اور انھوں نے اپنے بچوں اور پوتیوں سے قسم کھائی کہ وہ انھیں

اکیلا چھوڑ دیں گے اور اگر جانا پڑے تو ان کے بغیر چلے جائیں گے لیکن انھوں نے ان کی ایک نہ سنی اور وہ انھیں لے گئے۔ اپنی خواہش کے بغیر لے جانے کے خلاف انھوں نے سخت احتجاج کیا اور تمام راستے انھیں اپنے وطن میں چھوڑنے کی قسم دلاتے رہے لیکن انھوں نے مجبوراً ایک نہ سنی آخروطن کی سرحدوں کے قریب احتجاجاًخاموش رہے۔ اٹھانے والوں نے دونوں دادا دادی کی خاموشی کی وجہ دریافت کی مگراپنی زمین چھوڑنے سے کچھ قدم پہلے انھوں نے انھیں مردہ پایا،، ان سب نے سر جھکا لیا اور دونوں مرحوم دادا دادی کو ان کی زمین میں دفن کرنے کے لیے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔اس کے لیے انھیں چاہے جوبھی قیمت چکانا پڑے۔

معاوضہ

اس نے غزہ کے مظلوم لوگوں پرڈھائے جانے والے مظالم اور تباہی کی تلافی کے لیے ایک افسانہ سنایا، اس نے اپنے مالی نقصانات کو شمار نہیں کیا، نہ ہی اسے اپنی ران کے بڑے زخم کی فکر تھی، نہ ہی اس نے اپنے گھر اور مکانات کے ملبے کا معائنہ کیا۔ اس کے بھائیوں نے تباہ شدہ فرنیچر یا کسی عمارت کو زمین پر گرا دیا تھا،البتہ وہ غزہ کے سمندر کی طرف تیزی سے چلا گیا، جہاں اس نے ایک ہفتہ سمندری ریت سے مجسمے بنانے میں صرف کیا۔ ان لوگوں کی شکلیں جو اس نے اپنے خاندان میں سے کھودی تھیں۔آٹھویں دن کی صبح، اس نے اپنے ہاتھوں بنائے گئے مجسموں کے ایک گروپ کی تیاری مکمل کی، جس میں اس کے خاندان کے لاپتہ افراد کو مجسم کیا گیا تھا۔ اس نے تعظیم کے ساتھ ان کے مجسموں کو بوسہ دیا اور افسوس کے ساتھ پکارا: "آؤ، ان سب کے نقصان کا ازالہ کرو، ان کو دوبارہ زندہ کرو، کیونکہ ان کے نقصان کا یہ واحد معاوضہ ہے۔"

رٹنا

وہ کھڑا اس صیہونی بستی کو دیکھ رہا ہے جس کا افتتاح اس کی زمین کے باقیات پر ہوا وہاں پر اس کے ایک شہید درخت کے تنوں سے بنی بیساکھی کے علاوہ اس کی زمین پر کچھ نہیں چھوڑاگیا۔ اس کی زمین پروجودپذیر ہونے والے صیہونی گوشت کے کالم وہاں سے، پہاڑی کی چوٹی سے، اس بستی کے رقبے کو مکمل طور پر تلاش کر سکتے ہیں، بغیر کسی دقت کے اس میں موجود مکانات کی گنتی کر سکتے ہیں۔ اس کی پوتی نے اس سے سرگوشی کی: "ان میں سے بہت سارے ہیں، کیا وہ نہیں ہیں؟" اس کے دادا نے اسے جواب دیا جب تک کہ وہ بستی میں مکانات کی گنتی کر رہے تھے: "ان سب کو یہاں آنا چاہیے۔ میرے بچے۔ اس سرزمین میں وہ جہنم کے راستے میں کچلے جائیں گے۔ "

بانجھ پن

اگر وہ اس سے محبت نہ کرتی تو بھی اس کی شرافت کی تعریف اور موت سے محبت کی وجہ سے وہ اس سے محبت کرنا چاہتی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ وہ شخص نہیں ہے جو اس کے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، بلکہ وہ فلسطینی کیفیہ پہننے والا نائٹ ہے جواپنے اور اس کے لوگوں پر صیہونی کمینے کی حکمرانی کو قبول نہیں کرتا تو میں نے اس سے شادی صرف اس بناپر کی کہ وہ اپنے ملک کو گوریلا فراہم کرنے کے لیے اس کے ساتھ بچے پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ اس سے اور اس کے پیارے شوہر سے اپنے مقبوضہ وطن کو آزادی دلانے والے ہیرو پیدا ہوسکیں، لیکن اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ وہ بچے پیدا کرنے والے جراثیموں سے پاک ہے اوراپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے ہیرو پیدا کرنے کی اس کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ بچے پیدا کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے بھی اس کی نا اہلی کی تصدیق کر دی تھی اور بانجھ اور بانجھ برسوں نے اس کی امیدوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا، لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس کا پیارا شوہر اپنے وطن کے لیے کم سے کم دو جنگجوؤں کو جنم دے۔اگرچہ اس کے رشتہ داروں میں سے اس کی دوسری بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

جو اسے وہ دے گی جو وہ اسے دینے سے قاصر تھی، اس نے اپنی حسد کی آگ کو خاموشی اور چپکے سے اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ بچے کی پیدائش کا انتظار کرنے لگی۔ جنگجو، چاہے وہ کسی دوسری عورت سے ہوں۔

چرچ

وہ مسجد اقصیٰ میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس اپنے گھروں کی طرف جارہے تھے جبکہ ان کے اہل خانہ دوپہر کا کھانااکٹھے کھانے کے لیے ان کا انتظار کر رہے تھے، وہ اپنے گھروں کی طرف گامزن تھے کہ صیہونی فوجیوں نے ان پر حملہ کیااور سب کو چرچ آف ہولی سیپلچر کے راستے میں دھکیل دیا جس سے ان کو چھپ کرجان بچانے کا موقع ملا۔ یہ ایک فلسطینی کلیسا ہے جس کا دل آدھا فلسطینی اور آدھا مسلمان ہے۔

چرچ کا پادری وہاں پر پناہ لینے والے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے پرعزم تھا جبکہ صیہونی گولیوں نے ان سب کو قتل کرنے کا عزم کر رکھا تھامگرچرچ میں فلسطینیوں کا خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت ایک مسلمان اور ایک عیسائی کو گلے لگانے والے چرچ میں ایک فلسطینی کا خون بہایا گیا تھا۔ صیہونی فوجی وہاں سے چلے گئے اور فلسطینی شہداء کوچھین لیا گیا اور کلیسا اپنے زائرین کے لیے کھلا رہا۔

دوائی

جنین شہر میں ایک ماہ سے زائد عرصے سے کرفیو ہے، محاصرہ کیے گئے فلسطینیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے اور نہ ہی پناہ لینے والے فلسطینیوں کے ٹھکانے بتائے ہیں۔ وہ پانچ سال کا بچہ ہے اور پوری طرح سے نہیں سمجھتا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کی ماں کی دوا ختم ہو گئی ہے، اور یہ ایک اہم دوا ہے جو اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ اس کے دل کی دھڑکن جاری رہے، اور یہ کہ اگر وہ اس کے بغیرایک دن بھی رہی تو وہ مر جائے گی، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کوئی کرفیو کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، ورنہ گولیاں اس کے جسم کو چھید کر دیتیں،مگر پانچ سالہ بچے کوموت کا ڈر نہیں، بچے کو ماں کی جان عزیز ہے اورماں کو بچے کی زندگی جان سے بھی پیاری ہے۔ وہ چپکے سے ماں کی دوائیوں کا ڈبہ اپنی جیب میں رکھتا ہے، چمڑے کے چھوٹے جوتے پہنتا ہے، گھر کی ڈور بیل کی کنڈی سے چپکتا ہے، اسے کھولتا ہے اور سیدھا گلی میں داخل ہوتا ہے۔

چند ہی لمحوں میں تین صیہونی ٹینکوں نے اسے گھیر لیا، حفاظتی ڈھالوں کے پیچھے سے صیہونی نگاہیں اسے خوف سے دیکھ رہی تھیں اور ایک صیہونی فوجی نے اے لنگڑے، عربی میں چیخ کر کہا: ”تم اپنے گھر واپس جاؤ! “چھوٹا لڑکا اپنی ہمت جمع کرتا ہے، وہ تیزی سے اپنے چھوٹے سے ہاتھ کوپتلون کی جیب میں ڈالتا ہے، دوائیوں کا ایک خالی ڈبہ نکالتا ہے، اور اٹوٹ، بچگانہ عزم سے بھرے لہجے میں کہتا ہے:

"مجھے اپنی ماں کی دوا لینے جانا ہے۔ میری ماں۔ تاکہ وہ بیماری سے نہ مر جائے۔"

وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اپنے راستے پر ایک جرات مندانہ قدم اٹھاتا ہے، اور صیہونی دشمن کی گولیوں کی آواز بلند ہوتی ہے، جو اس کے بچگانہ عزم کو مارنے کے لیے اس تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کے دوسرے قدم میں ایک ہی وقت میں تمام گولیاں اس پر لگیں اور وہ زمین پرگر گیا، اس کا چھوٹا سا ہاتھ دوائی کے خالی ڈبے کو لے جانے سے انکار کر رہا تھا۔

مرد

وہ صیہونی فوجی کو گالی دے رہی تھی اور اسے اپنے جوتے سے مار رہی تھی، جب اس نے اسے اپنے گاؤں میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے زبردستی پیچھے دھکیل دیا، جس سے وہ تقریباً زمین پر گر گئی۔ ظاہری شکل اور لہجہ یہ کہ وہ ایک عرب غدار تھا جسے دشمن کی صفوں میں بھرتی کیا گیا تھا۔ اس نے بدمعاشی کے ساتھ اسے مرد سپاہیوں سے دور رہنے کا حکم دیا جب تک کہ ایک خاتون صیہونی فوجی کی طرف سے اس کی تلاشی نہ لی جائے۔

فلسطینی عورت نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے نفرت سے پوچھا: ”مرد کہاں ہیں؟“

جدوجہد

اسے زندگی میں ایک وصیت معلوم ہوتی ہے جوہرلمحے اس کے اندر رہتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ فلسطین کو صیہونیوں سے آزاد کرانا چاہتا ہے، جنھیں وہ حرام کی اولاد کہتا ہے۔ وہ اپنے کیس کے بارے میں نظریاتی، سیاسی اور فکری تنازعہ کے متعلق زیادہ نہیں سمجھتا ہے، اور وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا ہے، اس نے اپنی پوری سوچ کو ایک جملے میں مقیّدکررکھا ہے: "میں مقدس مسجد کے بچوں سے اس وقت تک لڑوں گا جب تک کہ میرے وطن فلسطین کو کتوں کی طرح چھوڑ دو یا وہیں مر جاؤ۔

اس نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا سوائے شادی، کام اور خوابوں کے۔وہ اپنے خوابوں میں بھٹکتا رہا یہاں تک کہ ایک کمانڈو آپریشن میں اسے موت کا احساس ہواحملے میں اس کے ایک کیمپ کو اڑا دیاگیا۔ زندگی کے آخری لمحے طے ہونے سے پہلے، اس نے خوشی سے اپنے آپ سے بات کرتے ہوئے کہا: "میں ان کے مرنے تک ان سے لڑا۔"

خصوصی کیس

اپنی پیدائش کے بعد سے ہی وہ متعدد معذوریوں کا شکار ہے۔متعدد معذوریوں میں سے ایک وہ بولنے سے قاصر ہے اور اپنی ذہنی پسماندگی کے باعث اسے تصورات اور خوابوں کی دنیا میں ایک پاک پرندے کی طرح جینا ہے سوائے اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے جو اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

اس کی ماں کی ہمیشہ سے خواہش رہی کہ وہ اس سے اپنی زندگی میں ایک لفظ بھی سنیں اور اس امید کو پورا کرنے کے لیے وہ اسے دستیاب ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے گرد گھومتی رہی مگر ناممکن کی طرف بھاگ رہی تھی۔

حتیٰ کہ صیہونی بمباری کے باعث وہ آگ میں نہا گیا حالانکہ وہ ایک فرشتہ پرندہ ہے جو متعدد معذوریوں میں مبتلا ہے، اور صیہونیوں کے لیے خطرہ یا ان کے خاندان اور لوگوں کے لیے امید یا فائدہ نہیں ہے۔

بمباری کے نتیجے میں اس کے گھر کی چھت اس کے سر پر گر گئی، وہ کئی دنوں تک شہیدوں کے درمیان لاپتہ رہا یہاں تک کہ اس کی والدہ نے اسے شہر کے ایک اسپتال میں موت کے داغ دار بستر پر اکیلا پایا۔ماں نے بچے کوگلے لگایا، اسے بوسہ دیا اور اداسی اور پریشانی سے بھرا ہوااس کا سر اپنے سینے پر رکھا اور وہ اس کی طرف مسکرایا اور ایک لفظ بولا جو صرف زخمیوں، طبیبوں اور مہمانوں کی زبانوں سے چوری کیا گیا تھا: "فلسطین۔"

اس کی ماں کا بیٹا

وہ خصوصیات، شکل و صورت اور ایک سریلی آواز کے ساتھ اپنی ماں کا بیٹا ہے جو کہ گاتا ہے، منتر کرتا ہے یا قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے تو پتھروں کو بجنے کی صلاحیت مل جاتی ہے لیکن فلسطین سے محبت اور اس کے قبضے کے خلاف جدوجہد میں وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔

وہ واحد شخصیت ہے جس نے اپنی پوری زندگی اس کی پرورش میں گزاری جب اس کے شوہر کی موت اس وقت ہوئی جب وہ جوان تھا۔ اس نے اسے دولت مند، بے سہارا بیوہ کی طرح لاڈ پیار کیا، یہاں تک کہ اس کی نگہداشت میں رہنے والی آرام دہ زندگی کی وجہ سے وہ "اپنی ماں کا بیٹا" کہلانے لگا۔

میں نے اس کی طرف سے ہر سستی، کوتاہی اور اس پر بھروسہ قبول کیا، جب تک کہ وہ اپنے وطن فلسطین سے غداری نہ کرے، کیونکہ یہ اس کے نزدیک کفر ہے جسے وہ قبول نہیں کرتی۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ نوجوان صیہونی فوجیوں کے لیے کیسے، کب، کہاں اور کیوں سستا ایجنٹ بن گیا، لیکن وہ یقینی ثبوت کے ساتھ جانتی ہے کہ وہ اپنے خاند ان کے فدائین کا خطرناک کار مخبر تھا، اور وہی ان کے قتل کا سبب بنا۔

اب وہ یقین سے جانتا ہے کہ وہ کئی ایک فلسطینی گوریلوں کو اطلاع دے گا،کیونکہ وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی سرگرمیوں سے ان سے قربت کی وجہ سے واقف ہے اور اس

کی ماں ان میں سے ایک ہے۔ اس کے خیال میں، وہ اب ایک دیو ہیکل، خالص بلوط سے کٹی ہوئی مردہ، ناپاک شاخ بن چکا ہے، جو زندہ رہنے اور زمین میں گھسنے کے لیے پرعزم ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ اس سڑتی ہوئی شاخ کو کاٹ دیا جائے، حالانکہ یہ ماں کے دل کا پھل اور اس کی زندگی کی فصل ہے۔ اس نے علاقے کے گوریلوں کو اس کے بارے میں مطلع کیا تاکہ وہ اس غدارکو سر پکڑ سکیں، اور اس نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ وہیں پہاڑ میں اپنی کارروائی مکمل کریں تاکہ وہ اسے شرمندگی اور دھوکہ دہی میں لپٹا ہوا پڑے نہ دیکھے۔

گیلوٹین کی رات، اس نے شام کی نماز پڑھی، وہ ایک لمبی رات محفوظ اور اپنے کیے پر مطمئن ہو کر سوئی، اور بھول گئی کہ اس کا ایک بگڑا ہوا، غدار بیٹا ہے جس کی روح آج شام جہنم میں جائے گی کیونکہ وہ اس کی ماں کا بیٹا نہیں۔

ایک مسکراہٹ

مسکراہٹ نے زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑاحتیٰ کہ اس کے چہرے کے پٹھے ایک ایسی ہیئت میں ڈھل گئے کہ بڑی سے بڑی اداسی، درد، محرومی اور مایوسی کوبھی نگلنے کے قابل ہو گئے۔

یہاں تک کہ اس کی مسکراہٹ صابرہ اور شتیلا کیمپ میں ہونے والی نسل کشی کے مناظر کی یاد کو نگلنے میں کامیاب رہی اوراسی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر دفن کرنے میں کامیاب رہا۔ جب اس نے اپنے خاندان کا جلاسڑا گوشت کیمپ کی گلیوں میں ٹکڑوں کی شکل میں دیکھا جسے موت نے روند دیا تھا۔ پوری دلیری اور گستاخی کے ساتھ۔

اس کی مسکراہٹ نے ایک یتیم کو پیار کرنے اور اس سے شفقت کی بھیک مانگنے سے بھی روک دیا جب وہ رضاکارانہ طور پر گوریلوں کی صفوں میں شامل ہوا تو یہ اس کا مخصوص نشان بن گیا۔ ایک فلسطینی کی آنکھوں میں آنسو۔

اس کی مسکراہٹ اس لمحے مزید نکھرگئی، جب وہ اس موت کا تعاقب کرتا ہوا اس رات ڈسکو کو زمین کے چہرے سے مٹانے کے لیے دھماکہ خیز بیلٹ کے فیوز کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، جس پر صیہونی فوجیوں کا ہجوم تھا۔ کچھ دن پہلے، غزہ کی پٹی میں فلسطینی بچوں کے ایک اسکول کی تباہی کے طوفان کی قیادت کی، اس کی مسکراہٹ اور بھی زیادہ پھیل گئی، اس کی ہانپیں بلند ہوئیں اور اطمینان کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر عیاں ہوگئی۔

پہاڑ

دور دراز، بنجر پہاڑوں کی طرف صیہونی حملہ آور دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ان پہاڑوں، شہروں، دیہاتوں اور ساحلوں میں رہنے والے لوگوں سے بے خبر، ان پر نئی بستیاں بنانا چاہتے ہیں۔ مگرصرف وہی لوگ جو رات کے وقت ان کی طرف بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ انھوں نے فیصلہ کرلیاہے کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر فلسطینیوں کے علاوہ کوئی اور نہیں جائے گا، وہ چاہتے ہیں کہ اس سے صیہونیوں کے پاؤں اور ان کی گاڑیاں پھسل جائیں گی۔ ان کی طرف سے، ایک چیخ بلند ہوجو آسمانوں اور زمین کو ہلا دیتی ہے اور کہتی ہے: "اے آواز سننے والے!

فلسطینی اپنے پہاڑوں کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنتے ہیں وہ فوری جواب دیتے ہیں اور اپنے کچھ خاندان، بچوں اور کچھ سامان کو لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے کے لیے دوڑتے ہیں، اس سے پہلے کہ صہیونی غاصب ان پر قبضہ کر لیں، اور اپنے خاندانوں کو اپنے گھروں میں چھوڑ دیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کو ان فلسطینیوں کے بچوں نے مضبوط کیا ہے جو مدد کے لئے ان کی پکار کا جواب دیتے ہیں، اور وہ پُر وقار اورپُرسکون واپس آتے ہیں، وہاں پر ان کی موجودگی سے پہاڑوں کو زندگی کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔

دھوکہ

پہلی بار، وہ اپنے ضمیرفروشی کی قیمت وصول کرتا ہے اور رقم اپنی جیب میں رکھتا ہے، وہ پیسے گننے، ان پیسوں سے پیاروں کولطف اندوز ہونے اور ان کی خوشبو سونگھنے کے بعد خوش نہیں ہوتا، اس کی پیسوں کی بھوک مزید بھڑک جاتی ہے اوراس کے ضمیر کو اور زیادہ بے حس کردیتی ہے۔ اور اسے وہ اپنا عرفی نام (غصہ کرنے والا) بھول جاتا ہے جو اس کی ماں نے اسے اپنے ملک کے ساتھ غداری اور اس کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد کی وجہ سے پکارا تھا۔

اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس بار اس کے اپنے وطن سے خیانت کی قیمت کم ہو یا بڑھے۔ اسے چند گھنٹوں کے بعد آگ میں جھونک دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ اس کی جیب میں موجود رقم اس کے رواج کے مطابق ہے، اور اسے اس بات کا خوف نہیں کہ اس کا حال کھل جائے گا اور فلسطینی گوریلے غداروں کی طرح اسے ذبح کرنے کے لیے دوڑیں گے۔ جیسا کہ دیگر غداروں کو انھوں نے اس کے سامنے ذبح کیا۔

وہ فلسطینیوں کے پیروں تلے مرنا نہیں چاہتا، وہ زیتون کے درخت پر لٹکایا جانانہیں چاہتا کہ پرندے اسے کھائیں، اور نہ ہی وہ کسی کے رونے یا روئے بغیر گلا کاٹ کر محلے کے چوکوں میں سڑنا چاہتا ہے۔

اس نے اپنی مرضی کے مطابق مرنے کا فیصلہ کر لیاہے۔ اب وہ تمام جہانوں کی مرضی کے خلاف اپنی تقدیر بدلنا چاہتا ہے۔ اس کی ماں کا کچھ دن پہلے انتقال ہو گیا تھا اور وہ اپنے بیٹے کودیکھنے سے انکاری تھی۔ کیونکہ وہ غدار ہے۔ وہ کسی نیک بیٹے کی طرح اس کے جنازے میں شرکت کرنے، اس کا تابوت اٹھانے یا اس کے ساتھ اس کی قبر تک جانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک شرمناک غدار ہے۔فلسطینی گوریلوں کی آنکھیں صرف ایک گولی سے اس کے سستے سر کا شکار کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

وہ معمول کے مطابق صیہونی کیمپ میں داخل ہو ا اور وہ صیہونی افسروں سے ملاقات کرے گا تاکہ انھیں کچھ فلسطینی گوریلوں کی نقل و حرکت کے بارے میں قیاس آرائی پر مبنی نئی معلومات فراہم کرے۔ دھماکہ خیز بیلٹ جسے وہ اپنے تمام گناہوں سے پاک کرنے کے لیے محفوظ کر رہا ہے۔

وہ مر جائے گا اور وہ سب مر جائیں گے کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ غدار نہیں بلکہ قربان ہو کر مرے گا، لیکن جنت میں اس کی ماں کو اس پر فخر ہو گا، اور اسے معلوم ہو گا کہ اس کے بدبخت بیٹے نے آخری وقت میں معافی مانگ لی تھی۔ ملاقات کا مقررہ وقت قریب آ گیا اور وہ کیمپ میں داخل ہوا اور مناسب وقت پر اس کی ماں کی مسکراہٹ اس کے اندر چمکی اور اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

تقریر

جو بھی دولہا اسے پروپوز کرتا ہے، وہ کسی نہ کسی عیب سے اسے ملامت کرتی ہے، پھر وہ اسے ٹھکرا کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور بہت دنوں تک روتی رہتی ہے، پھر وہ اس کے بعد باہرچلی جاتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ وہ نہیں چاہتی اپنے منگیتر (حسن) کی شہادت کے بعد وہ دوبارہ اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آکراپنے لیے کسی اورکو پروپوزکرے۔وہ اسے دوبارہ ملامت کرتی ہے، پھر اپنے کمرے کی طرف بھاگتی ہے اور کئی دنوں کے لیے روتی رہتی ہے۔ وہ ایک ایسا دولہا چاہتی ہے جس میں حسن کا قد، اس کی آواز، اس کی خوشبو، اس کی خصوصیات، اس کی سیر، اس کا کردار، اس کی ہمت، اس کی مسکراہٹ، اس کی فلسطین سے محبت اور اس کی نیند بھری آنکھوں میں محبت ہو۔

جبکہ کسی بھی مرد میں حسن کی خوبیاں نہیں تھیں برسوں گزرگئے کہ وہ اسے مردوں کے چہروں پر ڈھونڈتی پھرتی تھی اور اسی وجہ سے اپنے طویل غم کے باعث بدمزاج کہلانے لگی تھی۔

وہ اپنے خاندان کے ہمراہ آج شام کو اپنے گھر میں ایک نئے دولہے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے والدین کے چہروں کو دیکھے، جو اپنی موت کے بعد اس کی قسمت کے لیے بے چین ہیں۔ مگر دولہا سے مطمئن ہونا جسے وہ اپنے شوہر کے

طور پرپسند کرے ممکن ہی نہ تھا۔آخروہ گھر کے سامنے لٹکی ہوئی (حسن) کی تصویر کے سامنے یہ کہتے ہوئے گرپڑتی ہے کہ: "میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" حسن کے علاوہ اور حسن اس سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔

پودے لگانا

انھوں نے رواں سال اس کی فصل کو جلانے کے بعد اس کی زمین کو بلڈوز کر دیا، انگور کے باغوں پر جنگلی خنزیر چھوڑ دیے اور آخر کار اس پانی کے کنویں کو خشک کر دیا جس سے وہ اپنی فصلوں کو پانی دیاکرتا تھا۔ انھوں نے اس حقیقت کو بھانپ لیاکہ وہ ان میں سے واحد فلسطینی تھی، جنھوں نے اس کے فارم کے ارد گرد کے فارموں کو اس کے فلسطینی خاندان سے ضبط کرنے کے بعد کنٹرول کیاتھا۔ وہ ان راکشوں میں اکیلی ہے۔ ظالموں نے ایک ایک کر کے ان کے خاندان کے بچوں کو ان کھیتوں میں اس وقت مار ڈالا جب وہ کھیتی باڑی کر رہے ہوتے تھے۔ اب وہ مکمل طور پر اکیلی تھی، لیکن وہ مضبوط رہی۔ اس نے اپنی زمین سے اکھاڑ دیے گئے اناج کو دوبارہ لگایااور وہ سب فلسطینی کسانوں پرٹوٹ پڑے، جو سب اس کی مدد کے لیے آئے کہ اس کی زمین دوبارہ کاشت کریں۔

الزائمر

ساٹھ سال کی مسلسل جدوجہد اسے اپنے حق پر گہرے یقین سے ذرا بھی نہیں ہلا سکی،اپنی سرزمین سے چمٹے رہنے کی جدوجہداوراس میں کامیابی کا یقین چاہے پوری دنیابھی اس کے خلاف سازش کررہی ہوجہاں تک اس ملعون (الزائمر) بیماری کا تعلق ہے یہ وہی ہے جو اس کی یادداشت کو کھا جاتی ہے، کیونکہ اسے اپنی سرزمین کی حدود اور رقبہ کا علم نہیں ہے۔ اس پر درخت لگائے گئے، اس لیے وہ ان صیہونی آباد کاروں کے خلاف دائر مقدمات کی پیروی جاری نہیں رکھ سکتا جنھوں نے اس کی سرزمین کے شمالی حصوں پر جبر و استبداد کے زور پر اپنے ہاتھ مسلط کیے تھے۔ کیا الزائمر ایک صیہونی بیماری ہے؟ کیا یہ اس کی یاد کو کھا جائے گی جیسا کہ اس نے بہت سے لوگوں کی یادیں کھا لی ہیں؟

وہ فیصلہ کرتا ہے کہ حملہ کرنے کا بہترین طریقہ دفاع ہے، وہ اپنی سرزمین، اپنے وطن، اپنی جدوجہد اور اپنے دشمن کے بارے میں یاد رکھنے کے لیے ایک بڑی نوٹ بک میں لکھنا شروع کر دیتا ہے۔دشمن کو شکست دینے کے لیے اس نے ساز و سامان تیار کرنے کا ایک طریقہ دریافت کرلیا۔

عید کی پتلون

ایک بچگانہ، قطعی فیصلے کے ساتھ جو چیلنج، ردعمل یا اپیل کو قبول نہیں کرتا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عید پر نئے کالے کپڑے کی پتلون پہننا چاہتا ہے، دروازے کے پیچھے چھپے رہناچاہتا ہے۔

باپ کے پاس اسے اس فیصلے سے دستبردارکرنے کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا، جب تک کہ اس کا اکلوتا دیرینہ خواہش کے بعد پیدا ہونے والا بیٹا، جو طویل انتظار کے بعد اسے ودیعت ہوا تھا نے مضبوطی اور عزم کے ساتھ ایسا کرنے کا فیصلہ کیا، خاص طور پر جب اس کی بیوی نے ایک ذلت آمیز، التجا کرنے والے لہجے میں اس سے کہا۔: "اس چھوٹے سے ذہن کو مجبور کریں کہ عید کے کپڑے صرف اس جیسے چھوٹے بچوں کے لیے ہیں۔"

بگڑے ہوئے بیٹے نے اپنے والد کے ساتھ کام پر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں سے صیہونی قابضین کے ہاتھوں چھینے گئے کھیتوں سے فصلیں چننے کا مشکل کام کرے جس کے اختتام پر باپ اسے اس کے لیے اسے اس کی خواہش کے مطابق مطلوبہ پتلون خریدے گا۔

پہلی بار، بیٹا اپنے قابل فخر باپ کو، بے بس اور لاچارمحسوس کرتا ہے جب معائنہ کی چوکیوں پر اور اپنے وطن کے تباہ شدہ علاقوں میں داخل ہونے پر اسے غلاموں

جیسے سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اپنے کام کی جگہ، گھراور بیوی بچوں کے پاس واپس آنے کے لیے اسے طویل انتظار کی کوفت سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بچے، روزمرہ کا کھانا لے کر جاتے ہیں۔

سارا دن باپ نے سخت محنت کی، وہ دونوں دن بھرآرام بھی نہ کرسکے کیونکہ انہیں آرام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بیٹے نے اسے ٹوٹتے پھوٹتے اور احساس جرم کے چھپے ہوئے دیکھا جو اس کے دل میں گھوم رہا تھا اور اس کی چھوٹی سی روح کو کاٹ رہا تھا۔

شام کو بازار کی طرف لوٹتے ہوئے اس نے اپنے والد کو روکا جس کی چھوٹی سی نرم ہتھیلی باپ کی بڑی، کھردری اور خون آلود ہتھیلی میں سو رہی تھی اور اپنے والدسے کہا: ”ابا، مہربانی کرکے آج کام پر واپس نہ جانا۔ مجھے عید کے لیے نئی پتلون نہیں چاہیے کیونکہ بڑوں کو عید کے لیے نئے کپڑے نہیں چاہئیں۔“

منع کرنا

وہ اپنے والد ذیاب کو دیبو حبیبی کے نام سے پکارتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح، وہ سترہ برس کی عمر میں اپنے والد کو اپنی بیوہ ماں کے لیے شوہر، باپ اور کفیل کے طور پر دیکھتا ہے۔ وہ لطف اندوز ہوتا ہے جب اس کا باپ اسے اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھتا ہے اور اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھتا ہے جیسے کوئی شہزادہ جادوئی ڈریگن کی پشت پر سوار ہو۔

جب وہ صہیونی سپاہیوں کے ساتھ نہ ختم ہونے والی جھڑپوں میں پتھر پھینکنے کے لیے نکلتا ہے تو اس کا باپ اسے اپنے کندھوں پر اٹھانے سے منع کرتا ہے تاکہ وہ پرانے محلوں میں داخل نہ ہو سکیں یا فدائین کے مقام تک پہنچنے میں تاخیر نہ ہوجائے۔وہ گرفتاری کے بغیر اپنے دشمنوں کے چہرے سے فرار ہونے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

وہ اس وقت تک انتظار کرتا ہے جب تک کہ وہ بڑا نہیں ہو جاتا تاکہ وہ (دیبو حبیبی) کے ساتھ صیہونیوں کو سنگسار کرنے کی ڈیوٹی پر جا سکے۔ لیکن دیبو حبیبی نے اس کے بڑے ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ جب وہ صیہونی فوجیوں پر سنگ باری کر رہا تھا تو ایک قابض صیہونی کو چھینٹے مارنے کے بعد وہ واپس گھر آیا، بیٹے کواپنے کندھوں پر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ایک بڑی مسکراہٹ تھی جب اس نے آخری پتھر پر ہاتھ بند کیا تھامگر گولیوں نے اسے اتنا وقت

نہیں دیا تھا کہ جس نے بھی اس کی زمین چوری کی ہو، اسے پتھرمارے۔

وہ جلدی سے اپنے باپ کے داہنے ہاتھ کی طرف بڑھا،مٹھی کو کھول کراس سے پتھرگویا چھین کر جیب میں چھپا لیا، اور باپ کے کان میں سرگوشی کی: "(دیبو، میرا پیار) میں بڑا ہو گیا ہوں، کل میں پتھر مارنے جاؤں گا۔ یہ پتھر صہیونی فوجیوں کے منہ پر۔"

زیتون

بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے فلسطینی پہاڑوں میں زیتون کے باغ کی حفاظت اوراس کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے: "یہ درخت کوئی عام درخت نہیں ہیں جیسے ہر درخت قبر پر اگتا ہے بلکہ جب ہر گوریلا مر جاتا ہے تو وہ زیتون کا درخت بن جاتا ہے۔

چھوٹے بھائی نے جلدی سے اس جگہ کو دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کا باغ گوریلوں کے لیے ایک بڑا قبرستان ہے۔ کیونکہ اس کو ان درختوں سے منسلک قبروں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی ہے پھر اس نے پختہ لہجے میں کہا: "اس لیے زیتون کا درخت ایک مقدس درخت ہے؛ یہ فلسطینی گوریلوں کا درخت ہے۔"

درخت

صیہونی بکتر بند بلڈوزروں نے حج کے میدان میں زیتون کے درختوں پر اچانک حملہ کیا اور بڑی مشکل سے ان میں سے بہت سے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اسی لمحے حجاج (فریزہ) کومدد کے لیے پکاراوراپنی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی طرف لپکا۔ اسے اپنے سر کی چادر کے ساتھ اپنی گود میں لے لیا۔ اس کی ہڈیاں اس میں تقریباً دھنس گئیں۔

یہ شہید درختوں کا قتل عام تھا جو بلڈوزر کی مزاحمت اور زنجیروں سے گھسیٹ کر زمین بوس کردیاگیا، لیکن ایک درخت نے قتل ہونے سے انکار کیا، اس کا تنا اپنے اندر موجودبندھن سے ٹوٹ گیا، اس نے ضرورت مندفریزہ کو نگل لیا۔ انھوں نے درخت کی شاخوں کی چوٹیوں کو سفید پردے سے باندھ دیا اور اس کی بڑی جڑوں کو بلڈوزر کرنااورروندنا شروع کر دیا جسے انھوں نے زمین کی گہرائیوں سے اکھاڑ پھینکا تھا، جس میں پتھر، کچرے کے ٹکڑے سے چپک گئے تھے۔

اس دوران چند صیہونی زندہ بچ جانے والے اس گوریلا درخت کے سامنے سے بھاگ گئے اور انھوں نے دوبارہ اس طرف واپس جانے سے انکار کر دیا جہاں فلسطینی لڑنے والا درخت کھڑا ہے اور انھوں نے اسے احتیاط، نفرت اور خوف (ملعون درخت) کا نام دیا۔

نومولود

یہ نوزائیدہ اس دن دنیا میں آیا تھا جس دن اس کے والد کا انتقال ہوا تھااور انھیں قریبی ہسپتال جانے سے روک دیاگیا تھا اور وہ اپنی ماں کے پیٹ سے اسفالٹ پر اترا تھا اور جب طلاق نے اسے اس کے پیٹ سے باہر نکال دیا تھااوروہ ہسپتال پہنچنے کی اجازت کا انتظار کر رہی تھی کہ صیہونی فوجی اسے اور اس کے شوہر کو اس ٹیکسی سے باہر لے گئے جس میں وہ ہسپتال جانے کے لیے سفر کر رہے تھے اور فوجیوں نے انھیں بے عزت کرنے کے لیے زمین پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، وہ گولیوں کے زخموں کی وجہ سے بے بس ہو کر زمین پر گر پڑی جبکہ اس کے شوہر نے ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کیا تو انھوں نے اسے گولیوں سے شہیدکردیا جس نے اس کے سینے سے زندگی کا شعلہ چھین لیا۔

لوگ باپ اور نوزائیدہ بیٹا اپنے کندھوں پر اٹھائے دادی اماں کے گھر واپس آئے۔ دادی نے اپنے شہید بیٹے کو غسل دیا اور اسے اپنے تابوت میں لے کر جنت میں اس کی قبر تک پہنچایا، نہ اس کے لیے غمگین ہوئی اور نہ ہی اسے آنسو بہا کر الوداع کیا، بلکہ اس کو ماں کے موافق مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کیا۔گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ خاموشی سے اپنے پوتے کو نہلاتی دھلاتی رہی، اسے کھلاتی پلاتی رہی، اس کے دوسرے معاملات کو بہتر کرتی رہی۔وہ اس کے بڑے ہونے کا انتظار کرتی رہی تاکہ وہ اپنے شہید باپ کااس سے بدلہ لے سکے، جس نے اسے اس کی سالگرہ کے موقع پر قتل کیا تھا۔

بہرا پن

جب وہ جوان تھاتوسن اسٹروک ہونے کے باعث ڈاکٹر اس کے علاج اوراس کے بارے کوئی پیش گوئی کرنے سے تھک گئے تھے، لیکن وہ بہرا ہی رہا۔ اس نے اپنی سماعت دوبارہ حاصل کرنے کا خواب نہیں دیکھا اور اپنے وطن فلسطین میں اجنبیوں کی چیخ و پکار کی آواز پربہرے پن کو ترجیح دی، مگر اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بچے کی آواز سن سکے جو اپنی خوبصورت تلاوت سے ممتاز تھا۔ قرآن پاک کی قرات سننے کی شدیدخواہش کے باعث زندگی میں ایک باروہ قرآن کی تلاوت سننا چاہتا تھا لیکن بہرے پن نے اس کی اس خواہش کوپوراہونے سے روک رکھا تھا۔

محلے کے ایک گھرمیں ہونے والے ایک بڑے دھماکے سے اس کی پسلیوں کو نقصان پہنچا اور اب اس نے دوبارہ آواز سنی اس دھماکے کی جس میں اس کا اکلوتا بیٹا، جس کی آواز فرشتوں کی سی تھی، نوبل قرآن حفظ کرنے کے گوشے میں مارا گیا۔

ماہی گیری

سمندر ان کی باتوں، ان کی تسبیحات، ان کے خوابوں ان کے شکار، کھانے اورخرید و فروخت کی رسومات کا عادی ہے، حتیٰ کہ ہنگامہ خیزی کے لمحات میں ان کی دعائیں بھی اس کا دل بہلاتی ہیں، اور ان باتوں پر اسے خوب ہنساتی ہے جب وہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا احاطہء رحمت اور تحائف۔ وہ ہزاروں سالوں سے ان سے محبت کرتا ہے، وہ فلسطینی ساحل کے لوگوں کو پسند کرتا ہے، جن کے ساتھ اس نے قدیم زمانے سے محبت کا رشتہ قائم کررکھا تھا۔

سمندر ان کے مصائب کی تفصیلات کو بھی محفوظ رکھتا ہے، اور صیہونی ماہی گیروں کو ان تک پہنچنے سے روکتاہے اور جب بھی صیہونی اپنے بالوں کو پھسلنے والے جھاگ کے ساتھ اپنے بالوں کے سرسبز رنگ کے احساس کو اداس اور غم کے ساتھ ہلاتا ہے۔

وہ اپنے فلسطینی ماہی گیروں کے دوستوں کے لیے اپنی کہانیاں، اپنے موتی، اپنی نرمی اور بہت سی مچھلیوں کا خزانہ رکھتا ہے، اور وہ طویل عرصے تک ان کے گانے کی آواز پر گاتا ہے، جو اس کی بے کراں روح کو گدگدی کرتی ہے۔

لیکن اب وہ تکلیف دہ تنہائی میں رہتا ہے کیونکہ وہ فلسطینی ماہی گیروں کو صیہونیوں کی محرومیوں کی وجہ سے اس کے قریب جانے سے قاصر دیکھتا ہے، وہ ان کے چھوڑے ہوئے

جہازوں کو اپنے سینے سے لگاتا ہے اور اپنے پانی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔

آج صبح اس نے صیہونیوں کو اس کی لہروں پر چڑھائی کرتے ہوئے اور فلسطینی ماہی گیروں کے جہازوں کو چرانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا، وہ ان پرامن ماہی گیروں کی فتح سے ناراض ہواجنھوں نے اپنے جہازوں کو اپنی لہروں کی بلند ترین سطح پر چڑھا دیاتب صیہونیوں کے ساتھ سمندر کو گرہن لگا۔ تو اس نے انھیں بندروں اور خنزیروں میں واپس بھیجا اور انھیں اپنی تہہ میں چھپے درندوں اور مچھلیوں کے لیے خوراک کی تلاش میں بھیج دیا۔ سمندر بہت ہنستا ہے جب وہ ساحل پر ایک چھوٹی خلیج میں ماہی گیروں کے بحری جہازوں کو لنگر انداز کرتا ہے وہ اپنے ماہی گیروں کے دوستوں کا ماہی گیری کے گانوں اور مچھلیوں کے گانوں کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔

لیڈر

وہ گھر میں، گلیوں میں اور گلی کوچوں میں اس کی تقلید کرتا ہے اور اگر اس کی آنکھوں میں اطمینان نظر آتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے،وہ صرف دو سال عمر میں اس سے بڑا ہے، اگرچہ وہ سات سال کا ہے لیکن وہ اسے اپنا استاد، اپنا گاڈ فادر اور اپنا لیڈر مانتا ہے۔

اس نے صیہونی فوجیوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرتے تھے۔جب بھی اس نے کسی صیہونی کو سنگسار کیا تو اس کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں۔ وہ اپنے بھائی (عبداللہ) کی اطاعت کرتا ہے جو زندگی میں اس کا سپریم لیڈر ہے۔

صیہونیوں کو سنگسار کرنے کے بعد اس نے سنگسار کرنے کا سامان اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح بھاگا لیکن ایک دیو ہیکل بالوں والے ہاتھ نے اسے پکڑتے ہی اس کے کندھے کو کچل دیا اور پلک جھپکتے ہی چندسپاہیوں نے اسے ہتھکڑیاں لگا دیں اور اسے اعترافِ جرم کرنے کا حکم دیانیز اس شخص کا نام بھی پوچھ لیا جس نے اسے پتھر مارنے کے لیے اکسایا۔ اس نے جواب دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور بڑے پُرجوش انداز میں کہا: ”وہ میرا بھائی ہے جس نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔“

مشتعل فوجی اور بکتر بند گاڑیاں ”دہشت گرد عبداللہ“کی گردن میں کیلیں گاڑنے کے لیے آگے بڑھیں، جیسا کہ انھوں نے

اسے پکارا۔ انھوں نے اس کے گھر کو گھیرے میں لے لیااور (عبداللہ) کو بیل ہارن کے ذریعے حکم دیا کہ وہ ہتھیار اٹھائے ہوئے، اپنے چھوٹے بھائی کی جان بچانے کی خاطر، جس کے گلے میں شیطانی ناخن تھے اس گھر کو مسمار ہونے سے بچانے کے لیے، ہتھیار ڈالنے کے لیے نکل آئیں، ورنہ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے گھرکو اڑا دیں گے۔ تیس سیکنڈ گزر نے سے پہلے وہ ہتھیار ڈال کر ان کے سامنے آجائے۔

عبداللہ جلدی سے باہر نکلااس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنی دائیں ہتھیلی کی انگلیوں میں کینڈی کا لالی پاپ پکڑا ہوا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ زمین پر گر جائے گا اور وہ کھو جائے گا۔

آخر کار صیہونی فوج نے مزاحمت کے سپریم لیڈر کو، جس کا نام عبداللہ سات سالہ بچہ ہے، کو بچگانہ شرٹس اور کینڈی لالی پاپ کے ساتھ گرفتار کر لیا!۔

ابتدائی طبی امداد

یہ ایک تنہا اور خوفناک رات ہے جس طرح کہ صیہونی بمباری کی زد میں فلسطینیوں کی تمام راتیں ہوتی ہیں۔شہر کے لوگ آگ، لوہے اور محاصرے کے سیلاب میں رہتے ہیں۔

ہاشم ابو الخیر، پیرامیڈک، اپنے نرسنگ عملے کے ساتھ زخمیوں کو لے جانے کے لیے پرعزم ہے باوجود اس کے کہ ایسا کرنے کے لیے آگ کی ایک بیراج کے نیچے سے گزرنا پڑتا ہے جو ان پر موت، آگ اور خوف کی بارش کرتی ہے۔

بیراج نے تیزی سے اس کے عملے کو کھا لیااب اس کے پاس عزم اور ایمبولینس کے اسٹیئرنگ وہیل کے سوا کچھ نہیں بچا تھا، جسے وہ خود چلا رہا تھا، جو زخمیوں کی آہوں اور جسم کے ان اعضاء کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکی تھی جو اپنے مالکوں کو کھو چکے تھے اور کھو رہے تھے۔

ایک طاقتور،خطرناک گولہ اس کے جسم کے اوپر سے تیر گیا، اس نے جلتے ہوئے جسم کے ساتھ درد کی پرواہ نہ کی، وہ زخمیوں کو پہنچانے کے لیے عزم اور ہمت کے ساتھ ایمبولینس کو چلاتا رہا۔ قریب ترین فلسطینی ہسپتال آگیا۔

بھائیو

وہ جب بھی اپنے عزم پر سوار ہو کر نکلتے، فخرکا مظاہرہ کرتے، فجر رائفل اٹھاتے، اپنی روح کو آزاد کرتے، غلامانہ زندگی کو حقیر سمجھتے ہوئے، اپنے دشمن سے لڑنے کے لیے سورہ الملک کی تلاوت کرتے جسے وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

علی الصبح اس نے اپنے فلسطینی بھائیوں کے خلاف ہتھیاراٹھانے اوراس پر مجبور کرنے والوں کو لعن طعن کیا، وہ سیاست کو نہیں سمجھتابلکہ اس سے سخت نفرت کرتا ہے اور وہ کسی بھی فلسطینی پر ظلم وستم کرنے کے خلاف ہے۔ چاہے وہ اس کی سیاسی یا فکری رائے سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہواور اقتدار پر متحارب فلسطینی دھڑوں کی جدوجہد کے جھنڈے تلے ہو۔ عہدے، اثر و رسوخ اور مراعات سے وہ متاثر ہونے والا نہیں ہے۔

اس نے ایک سے زیادہ بارفلسطینی بھائیوں کے خلاف لڑنے کے حکم سے انکار کیا اور جب بھی اسے اپنے بھائی کی قتل گاہ میں جانے پر مجبور کیا گیا تو اس نے اپنے گھر میں تنہائی اختیار کر لی اور اپنے صیہونی دشمن کی ہاں میں کبھی ہاں نہ ملائی اور ہمیشہ اس سے اختلاف کے راستے پر گامزن رہا۔

اس کا باپ

وہ برسوں سے باپ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے اور وہ اپنی بیوی عزہ سے ایک بچے کا باپ بننا چاہتا ہے کہ ایک دن اسے پوپ کا کلام موصول ہوگا۔ لیکن حمل کا عمل ہر بار اسے مایوسی کی طرف لے جاتا ہے،وہ اپنے بھاری اور بوجھل احساسا ت کواپنے اور اپنی بیوی کے سینے پر گھسیٹتا ہے، جو ایک فلسطینی کو جنم دینے کا خواب دیکھتی ہے جس طرح اس کے وطن میں دیگر عورتیں جدوجہد کی خاطر فلسطینیوں کو جنم دیتی ہیں۔

وہ باپ بننے کا خواب دیکھتا رہاجبکہ اس کی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ مصنوعی حمل کے مزید آپریشنز کے لیے پیسے بچاتی رہی۔

ایک دن کیا ہواکہ صیہونی دشمن کی طرف سے اس سکول پر ہوائی حملہ کیا گیا جہاں اس کی بیوی انتظامی محکمے میں اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کرتی ہے حملہ کئی جانیں لے لیتا ہے اور اس کی بیوی کی زندگی بھی ان زندگیوں میں سے ایک ہے۔

اس نے اپنی مردہ بیوی کو الوداع کہے بغیر چھوڑ دیا اوراس کی شہادت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ظالم صیہونیوں نے میری بیوی کو مارڈالا ہے جبکہ اس کے پیٹ میں اس کے بیٹے کو بھی شہید کردیا ہے اور وہ اب اس شہید کا باپ بن گیا ہے جسے اس کی ماں کے پیٹ میں ہوائی حملے میں قتل کر

دیا گیا تھا، اسے "پاپا" کہنے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ شہید بچے کا باپ اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی اپنے آپ کو باپ نہیں کہلوا سکا۔

شجرہ نسب

ریاضی کے استاد نے اپنے نوجوان طالب علموں کو گھر کاکام کی تفویض کرتے ہوئے کہا کہ وہ شجرہ نسب کے طورپر ایک خاندانی درخت تشکیل دے کر لے آئیں۔استاد کا مقصود یہ تھا کہ طلباء عملی طورپرنسل اورشاخ بندی کے معنی سمجھ سکیں۔ چھوٹی فلسطینی طالبہ نے اپنی ماں، پھوپھی، خالہ اور اپنے چچا کی بیوی کی مدد سے ایک بڑا خاندانی درخت تیار کیا جو قبضے کے بعد سے ان کے گھر میں رہ رہی ہیں اوراپنے خیال رکھنے والے شوہر سے محروم ہیں۔

دوسرے دن چھوٹی فلسطینی طالبہ اپنے ہم جماعتوں میں سب سے زیادہ قابل فخرلگ رہی تھی، جس نے ایک خاندانی درخت اٹھا رکھا تھا جس میں بڑی تعداد میں مجاہدین، ہیروز، شہید اور نظربند تھے۔ اسے اپنے خاندانی درخت پر فخر تھا اور اس نے اپنے احساسِ تفاخرکو اس وقت تک روکا نہیں جب تک کہ اس کے اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کے پاس اس نے اپنے خاندانی درخت جیسا خاندانی درخت اٹھائے ہوئے نہ دیکھاکیونکہ دوسرے خاندانی درخت میں بھی اس سے کم تر تھے۔

پھر وہ اپنے احساس برتری کی شکست پر مطمئن ہو کر خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی، اپنی پنسل کو تیز کیا اور اپنے درخت کی شاخوں کے لیے مزیدنئی شاخیں کھینچنے لگی اور صبر اور توجہ سے اپنے نام لکھنے لگی۔ بیٹیاں اور منتظر بیٹے جن کو وہ مستقبل میں جنم دے گی تاکہ وہ اپنے خاندانی درخت کو سب سے بڑے قربانی اور جدوجہد سے بھرپوردرخت میں تبدیل کردے۔

شہید

اس نے اپنی زندگی، دکھ اور جوانی کو سترہ جوان مرد اور عورتوں کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا، ان میں سے کوئی بھی اس کا بیٹا نہیں تھا کہ جسے اس نے جنم دیا ہو اگرچہ وہ سب اس کے بچے تھےبہن اوربھائی جن کی پرورش اس نے ایک شہید باپ کی غیر موجودگی میں کی، ایک زیر حراست بہن، یا صیہونی قبضے سے منہدم کیے گئے گھر کے۔ سوائے اس کے کہ (رمزی جو اس کا بیٹا، خون، گوشت اور رحم ہے۔ وہ اس کی قیمتی یادگار ہے۔ اس کا پیارا شوہر جو لبنان میں فلسطینیوں کی جدوجہد سے نکل گیا تھااور کبھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ دنیا کے کسی حصے میں زندہ اور پھل پھول رہا ہے وہ ایک مقصد کے لیے جی رہا ہے کہ فلسطینی جدوجہد کے لیے بچوں کو تربیت دینا ہے۔ لیکن وہ جانتی ہے کہ زمین کی گہرائیوں میں کوئی نہیں ہے، اسے موت کے سوا کوئی چیز اپنے بیٹے (رمزی) کو دیکھنے سے نہیں روکتی، جو اپنے باپ کی طرح ہمت، مہربانی اور اپنے ملک سے محبت کرنے والا تھا۔

(رمزی) چند روز قبل صیہونیوں کے خلاف انتقامی کارروائی میں نکلا تھا جب کہ آباد کاروں نے ان کے قصبے سے پانچ بچوں کو قتل کر دیا تھا۔رمزی واپس نہیں آیا جب تک کہ صیہونیوں نے اسے واپس نہ کر دیا۔ انھوں نے اسے محلے کی خواتین کو دکھایا تاکہ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے پورے خاندان سے بدلہ لیں گے، ان کے گھر والوں کو گرفتار کر کے انھیں

گلی میں پھینک دیں گے۔ لیکن محلے کی خواتین نے اپنے اور اس کے خاندان کو صیہونیوں کے انتقام سے بچانے کے لیے اس کی شناخت سے انکار کیا، سب نے بہت پہلے اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ کسی گوریلا کو شہید کیا گیا ہو یا کوئی گوریلا آپریشن کیا گیا ہو۔ تاکہ باقی کمزور اور بے دفاع لوگ صیہونیوں کے ظلم و ستم سے بچ سکیں۔

محلے کا آخری گھر رمزی خاندان کا تھا، انھوں نے اسے اپنی ماں کو اپنے پیٹ کے اوپر محسوس کیا، اور صیہونیوں سے کہا کہ ایک آنسو نہیں جھکیں گے۔ یا غم کا رونا اور یہ قبول نہیں کرے گا کہ سب ایک لمحے میں فنا ہو جائیں، اس کے خون بہتے ہوئے دل کی پکار: "میں نے اسے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا، میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ نہیں معلوم وہ کون ہے۔"

جل پری

بچپن سے ہی وہ اس سے بات کرنے اور اس سے سرگوشی کرنے کے لیے غزہ کے سمندر کا سہارا لے لیتی تھی،ان دونوں کے درمیان راز اور کہانیاں جوکہ نشر نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ وہ اس کی دلہنوں میں سے ایک ہے، اور اس نے اسے کس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ وہ نہیں جانتی تھی۔وہ پُرامید تھی کہ وہ ایک دن اس کے پاس اس کی خوبصورت آبی ریاستوں میں رہنے کے لیے واپس آئے گی، جہاں کوئی صہیونی دشمن اس پر بمباری نہیں کرے گا۔، کوئی محاصرہ اس کا دم گھٹنے والا نہیں ہے اور صیہونی قبضے کی وجہ سے کوئی ظلم، غربت، بے روزگاری یا بیماری اس پر ظلم نہیں کر رہی ہے۔

اس کا نام ہوریہ اس کی پھوپھی کے نام پر ہے اور یہ نام اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ متسیانگوں کی اولاد ہے، انسانوں کی نسل سے نہیں۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ اپنے دوستوں کے سامنے اپنے مفروضہ آبی ماخذ کے بارے میں شیخی بگھارتی ہے اور اس کے دوست اس کے جھوٹ اور فریب کو اس وقت تک قبول کرتے ہیں جب تک کہ وہ ان کے لیے دل دہلا دینے والے گانے گائے گی، وہ اپنی گہری، شفقت بھری آواز کے ساتھ جیسے گرمیوں کی رات گرم سمندر کی گرج کے ساتھ مانگے گی۔

جب صیہونی دشمن کے طیاروں نے اس کے محلے اور اس کے آس پاس کے محلوں پر بغیر رحم کے بمباری شروع کی تو وہ اپنے محبوب کے ساتھ نہیں تھی بلکہ وہ اس سے ملحقہ عمارتوں میں تھی جو زمین بوس ہو گئی تھیں۔ فلسطینی لوگوں نے اس کے گھر واپس جانے کے راستے بند کر دیے تھے، اس کے سامنے سمندر کے راستے کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ زخمی ہو گئی تھی لیکن زخم اس کے پاؤں پر نہیں، شدید خوف کی حالت میں وہ اپنے پیارے سمندر کی طرف بھاگنے لگی۔صیہونی ظالموں نے عمارتوں، گلیوں اور ہر اس چیز پر بمباری کی جو حرکت کرتی تھی یا نہیں کرتی تھی۔ چلو،بھاگو۔ وہ اپنے سامنے شدید تیز ہوا میں ایک ہوا کے جھونکے کی طرح اڑی جارہی تھی۔

وہ بمشکل سمندر تک پہنچی کہ جس کی سطح طیاروں کی گونج سے پریشان ہو گئی تھی، یہاں تک کہ ایک صیہونی گولے نے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے، اور اس کی روح سمندر کی جھاگ کی طرح چھلک گئی۔ اس کے جسم کے ٹکڑوں کے ٹکڑوں نے اس کو نگل لیا، اور اس خوبصورت دلہن کو سمندر کی نرم گرم لہروں نے اپنے اندر دفن کرلیا،اس صیہونی دشمن سے دور، اس کی خوبصورت دلہن کو ایک گونج دار، ہمدرد آواز سے قتل کردیاگیا۔

دیوار

نسل پرستانہ علیحدگی کی دیوار نے اسے اپنے سکول سے محروم کردیا، جس کی وجہ سے اس کے والد نے اسے علیحدگی کی دیوار کے دوسری طرف شہروں کے مضافات میں ایک دوسرے سکول میں منتقل کردیا، لیکن وہ اپنے سکول جانے کے لیے پرعزم ہے، جس کی کتابوں سے وہ محبت کرتا ہے اور دیوار کے پیچھے واقع اپنےسکول کی طرف چلتا رہتاہے، وہ اپنےسکول سے باتیں کرتا رہتا ہے اور جب وہ کوئی جواب سن کر مایوس ہو جاتا ہے تو فیصلہ کرتا ہے تو صیہونی فوجی اسے کراسنگ گیٹ سے دور دھکیل دیتے ہیں۔ محافظوں، ہتھیاروں اور کتوں سے لیس وہ اپنے پاگل کتے اس پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ ناپاک دانتوں سے اس کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور زمین پر بکھرے اپنے گوشت کے ٹکڑوں کے درمیان زندگی اسے چھوڑ کررخصت ہوجاتی ہے، وہ اپنے اسکول جانے کے لیے جدائی کی دیوار کو عبور کرنے کا خواب دیکھتا رہتا ہے، جس سے وہ پیار کرتا ہے۔

توہم پرست

ان کی دادی کو یقین نہیں آتا کہ ان کے دادا (ابو حسن) ایک دن فلسطینیوں کی موت کے دوران باہر گئے تھے اور پھر اس لمحے بھرکے لیے واپس نہیں آئے، انھوں نے انھیں برسوں تلاش کیا تاکہ وہ پاگل نہ ہو جائیں۔ اپنے بچوں کو یتیم، بھوک، اجنبیت اور تنہائی میں سڑکوں پر برباد ہوتے ہوئے دیکھتی رہی مگر اس نے اپنا ذہن قابومیں رکھنے کا فیصلہ کیا، [1]لیکن وہ اپنی کہانی سب کو بتاتی رہی (ابو حسن کا افسانہ)۔

وہ اپنے بچوں اور پوتیوں کو (ابو حسن کا افسانہ) سناتی رہی اور وہ سنتے ہوئے نہ تھکتے۔ابو حسن ہر جگہ صیہونیوں سے لڑتے رہے، بچے اور پوتیاں اپنے داداد کے لیے امن وامان کی دعائیں کرتے رہے اور دادا کی واپسی کا انتظار کرتے رہے اور وہ اپنے بے سہارا دادا کی واپسی کے انتظار میں بڑے ہوئے۔

تیس سال بعد دادا (ابو حسن) ایک سفید روئی کے تھیلے میں ہڈیوں کے ڈھیر کے ساتھ واپس آئے جب صیہونیوں نے ان کی باقیات کو چھوڑ دیا، بچوں اور پوتیوں نے انھیں ایک پروقار جنازے کے ساتھ دفن کیا جس میں ہر ایک نے شرکت کی (ابو حسن کا افسانہ)۔ پھر وہ خاندان کے گھر واپس آئے کہ دادی نے انھیں (ابو حسن کے افسانے) کا ایک نیا افسانہ سنایا۔

---

[1] پریوں کی کہانی فلسطینی بولی میں ایک کہانی ہے۔

لڑکی

وہ اب اس گلابی رات کا خواب نہیں دیکھتی جوعموماً خواتین کے تصورات، خوابوں اور ان کے دلوں کی کھڑکیوں پر دستک دیتے ہیں۔ جو ایک کانٹے دار انتظارکے ساتھ کھلے ہیں جو ان کے صبر اور برداشت کاامتحان ہوتاہے۔ جبکہ واحد خواب، اس کی روح کی گہرائیوں میں، اپنے کمرے کی کھڑکی کے پیچھے سے مسجد اقصیٰ کے میناروں اور گنبدوں کو دیکھنا،ان سے اذان اور تکبیریں سننا ہے۔ یروشلم کے شہر سے اس کی محبت، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، اس کے خاندان کے افراد، انسان، نسب اور زندگی کے لیے اس کی محبت سے بڑھ کر تھی۔

ہانپنا

غزہ میں شادی کے خواب دیکھنے والے تمام لوگ خواہ عورتیں ہوں یا مرد، ایک چھوٹی سی جگہ پر اپنے خوابوں کی تعبیر پر مجبور ہیں جبکہ خواب بڑے بڑے ہیں جو کہ تعبیر کی حد تک تنگ ہو چکے ہیں۔

وہ بھی، انھی کی طرح، شادی کی درخواستیں دینے کے نام سے جڑے ایک جابرانہ عذاب میں جی رہا ہے۔ ثمر، اپنے عاشق اور کزن کے ساتھ ایک چھت چاہتا ہے، اور خوشی بھی ایک پردہ چاہتی ہے اور شرکاء کی موجودگی غم کے ٹکڑوں سے اور صیہونی کے منہ سے نکلنے کی امید کے مطابق ہوگی۔

رنج وغم اس کی روح کو بساتے ہیں اورنگل لیتے ہیں اور وہ سراب کی دنیا میں ایک کھلونا بن کر رہ گیا ہے، کرائے کے لیے کوئی جگہ نہیں، برسوں سے محاصرے میں رہنے والے بازاروں میں خریدنے کے لیے کوئی سامان نہیں، معاملات کو آسان بنانے کے لیے پیسے نہیں۔، کوئی کام دستیاب نہیں ہے، اور کوئی شادی کا مدعو نہیں ہے جو محاصرہ، پابندی، قتل گرفتاری اور مہلک راستوں کی وجہ سے اس کی شادی میں شرکت کر سکے۔

اس کے چہرے پر اپنی محبوبہ (ثمر) سے اس کی شادی کے تمام راستے بند ہیں، اس کی امیدوں کو ہنگامہ آرائی اس طرح کھارہی ہے جیسے اس کے اکثر دوستوں، رشتہ داروں، ہم

عمروں کی امیدوں کو کھا یاجارہا ہو اور جاننے والے جو اس شہر میں ناممکن شادی کا خواب دیکھتے ہیں، جبکہ صیہونی دشمن برسوں سے ان کے جسم اور روح پر قابض ہیں اورانھیں اپنی زندگی میں سانس لینے کے لیے بھی بہادری اور جدوجہد سے کام لینا پڑتا ہے۔

اس نے ثمر کو حیران کر دیا جب وہ اپنے منہدم گھر کے سامنے بیٹھی، غزہ کے سمندر کو دیکھ رہی تھی، اس کے پاس جا کر اس کے کان میں سرگوشی کی، جو اس کی موٹی چوٹی کے پیچھے چھپی ہوئی ہے: "کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے خوشی سے بولی: "ہاں، میں تم سے شادی کروں گی۔"

"لیکن مجھے اپنی شادی کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں مل رہی۔"

اس نے جواباً کہا "ہم یہاں سمندر کے کنارے شادی کرتے ہیں اور اس کی چٹانوں کے درمیان رہتے ہیں۔"

سکول

اسکول اس کی تمام دنیا میں سب سے مقدس جگہ ہے، وہ بنیادی خدمات کی کمی کے باوجود اس کی پرانی عمارت سے محبت کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ خواب دیکھتاتھا اور جیسا کہ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ بڑا ہونے پر ڈاکٹربنے۔

ان کے پڑوس پر بمباری کے بعد صیہونی دشمن کی طرف سے اس کے چھوٹے سے کلاس روم کو اس کے خاندان، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے چند خاندانوں کے رہنے کی جگہ میں تبدیل کردیا گیا جس کے باعث جگہ تنگ پڑگئی اور وہ سب کھلے آسماں تلے پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

انٹرنیشنل ریلیف آرگنائزیشن، جو ان کے اسکول کی ملکیت ہے، نے اپنے گھروں سے محروم ہونے والے متاثرین کو زیادہ سے زیادہ دیر تک سکول میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اب اس کا کلاس روم ان سب کا گھر بن گیا ہے ایک دھندلا ہوا سبز بلیک بورڈ اس کی کلاس روم کی خصوصیات میں سے باقی رہ گیا ہے جس پر ریاضی کے چند سوالات ہیں جنھیں ان کے استاد نے تختہ پر چھوڑ دیا ہے تاکہ ہر کوئی انہیں اپنی نوٹ بک میں لکھ سکے۔ ہوم ورک اسائنمنٹ اس امید پر کہ وہ ان کا حل تلاش کر لیں گے۔

مگر اسے ان سوالات حل کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ایک شیطانی بمباری کی وجہ سے جو صیہونیوں نے ان پرکی اور

اس نسل کشی کے حملے میں وہ اپنی نوٹ بک، کتابیں اورسکول کا بیگ کھو بیٹھا۔

کئی دنوں تک وہ بلیک بورڈ پر مذکورہ سوالات کو دیکھتا رہا اب اس کا ذہن ایک ایسی روشنی سے روشن ہے جو اسے صحیح جوابات کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں توجہ کے ساتھ حل کرتا ہے، ایک ایسی توجہ جوایک فلسطینی لڑکے کے لیے موزوں ہے کہ وہ پڑھنا چاہتا ہے اور بڑا ہو کر ایک ممتاز ڈاکٹر بننے کی کوشش کرتا ہے۔

چہرہ

وہ اپنے معصوم،بھورے اور پُرسکون چہرے کو گہری خاموشی میں ڈوبا دیکھنے کا عادی تھا۔وہ دور سے ظلم یہودیوں کے بچوں کو اپنے گھروں میں گھرے ہوئے دیکھتا ہے، زیتون کے باغ جو صیہونی فوجیوں کی جانب سے قبضہ کیے گئے تھے، الگ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔اب صرف ایک ہی چیز رہ گئی تھی۔ انھوں نے فلسطینیوں کی زمینوں، ان کے رشتہ داروں کی زمینوں اور ان کے گاؤں کے بہت سے لوگوں کی زمینوں کو ضبط کرنے کے بعد یہ بستی بنانے کا پہلا منصوبہ بنارکھا تھا۔

وہ بچوں کو بور ہوئے بغیر دیکھتا ہے، وہ ان کے خوبصورت، رنگ برنگے کھلونوں کا جائزہ لیتا ہے، وہ اس کے پاس جاتا ہے، انھیں تھپتھپاتا ہے۔ اس کے چہرے سے وہ نہیں جانتا کہ یہ کس کا بیٹا ہے، لیکن اسے یقین ہے کہ اس نے کئی بار اس کا چہرہ گاؤں کے راستوں پر دیکھا ہے، وہ اپنے لمبے لمبے جسم سے نیچے پھسلتے ہوئے اپنے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے ایک بچے سے پوچھتا ہے۔ کیاآپ کی خواہش ہے کہ آپ کے پاس ان جیسے خوبصورت کھلونے ہوں۔کیا آپ ان کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں؟

بچہ اپنا سر دائیں بائیں ہلاتا ہے اور کہتا ہے: "میں ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں جانا چاہتا، میں یہاں کھڑا اس زمین کودیکھ رہا ہوں جو انھوں نے ہم سے کھیلنے کے لیے چرائی تھی۔ ہمارے زیتون کے کھیت جو ابھی تک زندہ ہیں انھوں نے اسے چرایا تھا، یہ زمین ہم سے ہے، میں اسے ایک دن واپس لینا چاہتا ہوں۔ "

سرنگ

وہ سرنگ تھی جس نے اس کی ماں کو چرایا تھا اور وہ اپنے بھائی کو اس لاعلاج بیماری سے بچانے کے لیے خفیہ اور غیر قانونی طریقے سے مصر کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔ اسے جانے کے دو ہفتے بعد اپنے راستے واپس آنا تھا، لیکن غزہ پر صہیونی بمباری نے اس سرنگ کو تباہ کر دیا، اس کے واپس نہ آنے کا راستہ کٹ گیا۔

ہر روز وہ مٹی سے بھری ہوئی سرنگ کی ایک طرف کھڑا ہوتا ہے، اپنی سانسیں روکتا ہے اور اپنی ماں کو مٹی کے اندر دفن کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے معجزانہ طور پر واپس آنے کا انتظار کرتا ہے، جس سے وہ سیمنٹ، اینٹوں اور اس ٹوٹتے ہوئے ملبے میں گھس گئی تھی۔

سات ماہ کے انتظار کے بعد، اس کے بھائی اسے بتاتے ہیں کہ ان کی ماں ان کے بھائی کے ساتھ رفح کراسنگ سے واپس آئے گی، جو صرف ایک دن کے لیے کھلے گی، وہ ان کی باتوں پر یقین نہیں کرتا اوراپنی ماں کا استقبال کرنے کے لیے ان کے ساتھ کراسنگ پر نہیں جاتا اور اس کے سرنگ سے نکلنے کا انتظار کرتا رہا جس نے اسے نگل لیا اور نامعلوم لوگوں کی طرح غائب ہو گیا۔

سونا

یہ سب ٹھیک ہے اور یہ سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔ یہ کیا ہوا، اس نے کسی کو کیسے مارا، اس نے خود کو کیسے مارا، اگر آپ یہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی فکر نہ کریں یا نہیں جانتے کہ اس میں کیا خرابی ہے۔

جہاں تک بیٹے کی لاش کا تعلق ہے، جسم یا بیٹے کی لاش ایک سلامت چہرے کی شکل میں ہے؛ خنداں، وقتی طور پر، چینی زبان خاموش ہوگئی ہے۔ آپ فون جیسا فون کیوں نہیں خریدتے؟

تحفہ

اس کی چھوٹی بیٹی کو اس کی سالگرہ کے موقع پر تحفہ دینے کے لیے اس کی جیب میں موجود کم رقم کافی نہیں ہے۔ یہ دنیا کی کسی بھی لڑکی کے لیے قابلِ تحائف ہیں، سوائے اس کی بیٹی (نجوا) کے، جو ایک دن ایک فلسطینی ماں بن کر انقلاب اور فتح کی نسل کو بڑھاتی ہے۔

اس تھوڑی سی رقم اور اس کے علاوہ دن بھر کی محنت سے کمائی گئی رقم، ایک کتاب خریدنے کے لیے کافی ہے جو اسے علم سے پروان چڑھائے گی۔ وہ فخر سے اپنی چھوٹی فلسطینی شہزادی کے لیے کتاب خریدتا ہے اوراسے مستقبل میں ایک بڑے مشن کے لیے تیار کرتا ہے۔

فرار

اس نے خاندانی طریقے سے اس شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی تاکہ وہ اس مسلسل عذاب سے بچ سکے جس کا سامنا اس کے لوگ فلسطین میں کر رہے ہیں۔ اس نے ایک نیم خوشی سے اپنا کچھ سامان باندھ لیا، جوکہ اس نے سوچا تھا۔ اسے حقیقی اورسب سے بڑی خوشی اس وقت ہوگی جب آسمان سے اس کی طرف مدداوربچاؤ کی نوید آئے گی۔ تاکہ وہ بے رحم دشمن سے، مسلسل اور کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب سے، اورمحاصرہ کرنے والے مصائب سے بچ جائے۔ اپنی زندگی کے ہر حصے میں وہ ایک فلسطینی جلاوطن سے شادی کرے گی جو کہ کسی ایک لاطینی امریکی ملک میں رہتا ہے، اور وہ بغیر معائنے، چھاپوں، گرفتاریوں، قتل، زمینوں پر قبضے، اور چیک پوائنٹس سے فرار ہو جائے گی۔کیونکہ ان پر تشدد کی ایک کے بعد ایک شکل اختیار کی گئی، لیکن اب اسے ایک بھی صیہونی نظر نہیں آئے گا۔

اس آخری کراسنگ تک پہنچنے اور فلسطین کے آخری اسٹیشن سے نکلنے تک اسے الوداع کہنے کے لیے، اس کا بڑا بھائی ہی تھا جو آخری الوداعی اسٹیشن پر اس کے ساتھ تھا۔ جب تک کہ وہ اس سرحدی کراسنگ پر نہیں پہنچی،کراسنگ اور چوکیوں کے ذریعے اسے لازمی خوراک کی کمی اور تشدد جیسے مراحل سے گزرنا پڑا۔

پاسپورٹ پر مہر لگنے کے بعد وہ چند قدم اٹھاتی ہے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے فلسطین سے باہر ہو جائے گی،کیونکہ بالآخر وہ جدوجہد کی تاریخی کہانی سے بچ جائے گی اور وہ عیش و عشرت، سکون اور بے مقصدیت کی زندگی میں گم ہوجائے گی۔ خوشی، لذت اور لاڈ پیارکی زندگی، مگر تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی خاطر باعزت تاریخ نہیں چھوڑنا چاہتی۔آسان شرائط کے ساتھ ایک آرام دہ شادی کا سودا۔

وہ اپنے پاسپورٹ پر ایگزٹ سٹیمپ لگوا کر آگے بڑھنے کے بجائے کچھ قدم پیچھے ہٹتی ہے، وہ فخر سے اپنی فلسطینی شناخت کو جیب میں ڈالتی ہے، جیسے اسے ڈر ہو کہ یہ اس سے چھین لی جائے گی جو اس کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ وہ جھک کر اپنے بھائی کے ساتھ اپنے بیگ کو گھسیٹتی ہے... وہ فیصلہ کرتی ہے کہ بطور ایک فلسطینی عورت وہ اس وقت تک اپنے گھر میں ثابت قدم رہے گی جب تک کہ اس کا دشمن ایک دن جلد ہی وہاں سے نہیں نکل جاتا۔اب اسے ایسی شادی کی پرواہ نہیں جو اسے بہت دور لے جائے۔

قبرستان

یہ فلسطین کا سب سے بڑا تاریخی قبرستان ہے، جو ایک ہزار سال سے زیادہ پرانا ہے، تمام ثابت قدم فلسطینیوں کے چہرے آخر کار اس قبرستان میں ابدی نیند سو گئے ہیں۔صیہونی دشمن نے مقبوضہ فلسطین میں سب سے بڑی بستی کی تعمیر کے لیے قبرستان کوبلڈوز کرنے کا فیصلہ کیا۔

فلسطینیوں کی ہڑتالوں، مظاہروں اور دھرنوں کے باوجودصیہونی دشمن کی گاڑیوں کو قبرستان میں جھاڑو دینے اور پھر اسے بلڈوز کرنے سے نہیں روکا جاسکا۔قبرستان اس کی قدیم دیوار کو مسمار کرنے کے بعد قبروں کا تقدس پامال کیاگیا۔ ظالموں نے اپنے آرام گاہوں سے ڈھانچے کو مسمارکردیا اورمردوں کو کفن کے ٹکڑوں میں ڈھیر کر دیا۔

رات کو جلاوطن اپنی قبروں سے بیدار ہوئے، اپنے کفن اوڑھے اور اپنے صیہونی دشمنوں پر حملہ آور ہوئے تو جیسے ہی نیند اڑ گئی۔

پورے ایک مہینے سے فلسطینی فدائین اپنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کرتے ہوئے ان پر صیہونی طیاروں سے گولے برسارہے ہیں اوران پر گولے برسائے جارہے ہیں۔ بغیر خوف کے ثابت قدم، بھوک پیاس کاٹتے اورہڈیوں میں اتر جانے والی سردی سے بے خوف۔

اتفاق سے اس محاصرے میں آتے وقت موٹا روسی کوٹ اس کے پاس تھا جبکہ محل کے اس طرف محافظوں میں اس کے

ساتھی کے پاس کوئی کوٹ نہیں تھا، اور وہ بار باراس کاکوٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیران میں باہم تلخ کلامی بھی ہوئی،لیکن اس نے اصرار کے ساتھ ایسا کرنے سے انکار کر دیاکہ وہ اس کے لیے اپنا کوٹ کبھی نہیں اتارے گا۔

دنیا اس کی نظروں میں خالی لگ رہی تھی سوائے محصورین کے قلعہ کے اور وہ صیہونی محاصرہ جو وقتاً فوقتاً ان کا گلا گھونٹنے اور انہیں روئے زمین سے مٹانے کی کوشش کرتا ہے، جیسا کہ صیہونی ملعونوں نے اپنے لوگوں سے وعدہ کیا تھاکہ وہ سب کو فنا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانیت کو مٹانے کے بعد وہ تنہا دنیا سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اب وہ صیہونی فوجیوں کی دراندازی کو دیکھتا ہے،وہ سوچتا ہے کہ اس کے پاس اپنے دوستوں سے مدد لینے کا وقت نہیں ہے۔ اپنے دوست کے لیے اپنا کوٹ اتارتا ہے، اور اس سے کہتا ہے: "تمھیں اس کوٹ کی ضرورت ہو گی کیونکہ مجھے سردیوں کی اس ٹھنڈی جگہ کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی رائفل اور آخری گولی کے ساتھ دراندازی کرنے والے فوجیوں کو قلعے سے پیچھے دھکیلنے کے لیے روانہ ہوتا ہے اور اپنی زندگی کی آخری گولی تک کسی مدد کے بغیر لڑتا رہتا ہے۔

صحافی

وہ یہاں مرنے والوں،انقلابیوں اور خونی واقعات کی دلچسپ تفصیلات کے ساتھ ایک متنازعہ رپورٹ لکھنے آیا تھا جو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرسکے اور جس سے بین الاقوامی میڈیا کے ادارے کے لیے اضافی منافع حاصل ہوگا۔ وہ اس حوالے سے کام کرتا ہے،کہ اسے اپنے ادارے میں یا دوسرے بڑے اور زیادہ مشہور اداروں میں بہتر پیشکشیں ملیں اوروہ اس کو دل کھول کر اجرت دیں اور وہ اپنی ضروریات کو بہتر انداز میں پورا کرسکے۔

اس تصویری رپورٹ کو مکمل کرنا گویااس کے لیے فلسطین میں جاری اس ہولوکاسٹ میں ایک مظلوم شخص کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے، خواہ اس نے اپنے آپ کو صیہونیوں کا ساتھ دینے کے لیے پہلے سے تیار کیا ہو جو اپنے حامیوں کو دل کھول کر قیمت ادا کرتے ہیں اس کے علاوہ اس کی مہمان نوازی،خوشی، تفریح اور خوبصورت خواتین سے بھری فہرست کے ساتھ۔

اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ فلسطینی اسے اپنی دنیا میں واپس لے جائیں گے۔وہ اغواء کے بعد دوہفتے تک اس کے ساتھ رہا۔ ان کے مصائب کی ہزاروں تصویریں بنائیں اور صیہونیوں کی کئی فلمیں ریکارڈ کیں۔

اس نے اپنی تیار کردہ رپورٹ پریس ادارے کو بھیج دی جہاں وہ کام کرتا ہے، یہ جاننے کی زحمت کیے بغیر کہ رپورٹ

شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ اسے اندازہ ہے کہ اس کا یہودی مینیجر اس رپورٹ پر عملدرآمد کرے گا، جوکہ وہ نہیں چاہتا تھا۔

فلسطینی باغی اغوا کاروں نے اسے رہا کر دیا اور اکیلے جانے کی اجازت دے دی، لیکن وہ ان کے ساتھ رہنے کا عزم کر چکا تھا۔ انھوں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنے درمیان اغوا کر لیا تھا۔ اس نے فلسطینی کیفیہ ماسک پہنا اور ان کے راستے پر ان کا پیچھا کیا۔

دوست

اس کے تین دوست اپنے جنازے کے لیے چل پڑے وہ اپنے کپڑے لے جانے والی پالکی کو اسی طرح دفن کرنے کے لیے دیکھ رہے تھے جس طرح شہداء کو دفن کیا جاتا ہے۔ اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے وہ اپنے چوتھے دوست کواسٹریچر کواٹھالے جانے میں مدد دینے سے روکتا تھا، جسے کل صبح اسکول جاتے ہوئے ایک صیہونی اسنائپر نے مار دیا تھا جب وہ دونوں ساتھ چل رہے تھے کہ ایک سنائپر نے اس کا انتخاب کیا۔ اس کے دوست نے اپنی آخری سانسیں اس کے ہاتھ میں لیں، اپنے دوست کو اپنے سینے سے لگا کر الوداع کہا، لیکن وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

جب کبھی بھی اس نے اپنے ہم عمر لڑکے سے دوستی کی، صیہونیوں نے اسے چھین لیا اور موت کی گود میں پھینک دیا۔ اس کے استاد نے اسے بتایا کہ جنت میں اس کے تمام دوست خوش اور محفوظ ہیں وہ ان سے پیار کرتا ہے اوران کی دوستی کو پسند کرتا ہے، لیکن اسے ڈر ہے کہ اگرپانچویں دوست کا انتخاب کرے گا تو صیہونی اسے بھی اغوا کرنے کے لیے اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔

الکُوفیّۃ[1]

جب کبھی انھیں زبردستی اسلحہ اور بربریت کے زورپر گھروں سے نکال دیا گیا تو انھیں کہا گیا کہ وہ چند دنوں کے بعد ان کے پاس واپس آئیں گے جب وہ روانگی کے وقت پہلے اسٹیشن پر کافی دیر تک انتظار کرتے رہے تو اس نے اپنے گھر واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ کہ اپنی ماں، باپ اور بھائیوں کے لیے کچھ کھانا، کپڑے اور پانی لے آؤں، وہ انگور کی ٹوکریوں کے سایے میں بیٹھے اپنے گھروں کو لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے، جب کہ وہ اپنے ڈیروں میں گیہوں اور زیتون چھوڑ گئے تھے۔

واپسی پر گاؤں کے تین لوگ اس کے ساتھ تھے۔اندھیرے اوررات گئے گاؤں میں داخل ہونا آسان تھا لیکن وہ بمشکل اپنے محلے میں داخل ہوئے تھے کہ صیہونی غنڈوں نے انھیں گھیر لیا،انھوں نے اس کے ہمراہ موجود دو افراد کو مار ڈالا اور اسے بچا لیا۔ صیہونی فوجیوں نے اسے اپنی خدمت انھیں گاؤں کے گھروں تک پہنچانے کے لیے مجبور کیا گیا جہاں انھوں نے انھیں مارا پیٹااور تشدد کا نشانہ بنایا۔

وہ ان سے بچ کر اپنے گھر والوں کو یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا کہ مستقبل قریب میں اس کی اپنے گھر واپسی کبھی نہیں ہو

---

[1] **کےفےہ، یہ فلسطےنی مرد پہنتے ہےں اور یہ سفےد اور سےاہ ہوتا ہے۔**

گی، جہاں تک اس کے گاؤں کے بیٹے کا تعلق ہے وہ نقل و حمل اور جبر کے عذاب سے ہلاک ہو گیا۔

وہ روتا ہوا اپنے گھر والوں کے پاس لوٹا، بھوک اور محنت سے تھک گیاتھا اور سورج نے اسے اپنی شعاعوں سے ڈھانپ لیا، وہ اپنے اوپرہونے والے عذاب یا ناانصافی پر نہیں رویا بلکہ مجرموں کے بعد اپنے کھلے بالوں پر شرمندہ ہو کر رویا۔ صیہونی غنڈوں نے اس کی کیفیہ کو چرایا اور اسے کام کرنے پر مجبور کیا، اسے وقار، فخر اور وراثت سے محروم کر دیا، وہ اس وقت تک روتا رہا جب تک کہ اس کے والد نے اپنی ملکیتی واحد کیفیہ کو کاٹ کر اپنااوراپنے بیٹے کا سر ڈھانپ دیا۔

کراسنگ

یہ کراسنگ فلسطینیوں کے آنسوؤں،دکھوں،محاصروں، ان کی بھوک اور ان کی اذیتوں کی گواہی دیتی ہے، یہ وہی ہے جو اضطراب کو دور کرتی ہے۔ یہ وہی کراسنگ ہے جو ماں کواپنے بیٹے سے، بھائی کوبھائی سے اوربیوی کو اس کے شوہر سے محروم کرتی ہے۔

ہر روز یہ مصیبت زدہ لوگوں کے چہروں پر اپنے دروازے کھولنے کا خواب دیکھتا ہے، لیکن اس کا خواب خود ہی قیدی بنا رہتا ہے۔ جابر صیہونی فوجی اس سے فلسطینیوں کا دم گھٹ رہے ہیں، یہ سب صیہونی ہیں، خواہ ان کے چہرے، کھالیں اور زبانیں مختلف ہوں۔

آج کراسنگ نے اچانک اپنے خواب کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا، جب کہ سب بے خبر تھے، اس نے اپنے گھناؤنے جسم کو اس سڑتی ہوئی قید سے چھین لیا، دور بھاگ کر اپنی جگہ ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی جنھیں خود سے شرم نہیں آتی تھی۔

ایک پیشکش

وہ موت یا بھوک سے نہیں ڈرتا، وہ اپنی سرزمین سے زیادہ پیار کرتا ہے، لیکن اسے ڈر ہے کہ صیہونی غنڈے اسے اس کی بیوی، تین بیٹیوں اور پوتیوں کی عزت سے محروم کر دیں گے۔ صیہونی غنڈوں کی طرف سے پڑوسی دیہاتوں میں فلسطینیوں کی عزت کی بے حرمتی کے باعث دکھ اور کرب کی وجہ سے اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔

اس نے اپنی بیوی، بیٹیوں، پوتیوں اور اپنے بیٹوں کی بیویوں کو چھوڑکرفرار ہونے کا فیصلہ کیا اور ان سب کو غاصبوں کے ہاتھ سے چھڑانے کا فیصلہ کیا، جہاں تک اس کے پانچ لڑکوں اور ان کے بیٹوں کا معاملہ ہے۔ وہ ان لوگوں کے خلاف اپنی سرزمین کا دفاع کریں جو ان کی عزت کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔

وہ بھاگنے والوں کے ساتھ تیزی سے چلتا تھا، اپنی عزت سے محرومی کے خوف سے عورتیں آگے اور مرد پیچھے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب وہ سب اپنے وطن کے مشرق میں دریا پر پہنچے تو اس نے اپنی بیوی اور بیٹیوں، آمنہ کو ان لوگوں کے بازوؤں میں چھوڑ دیا جو دریا کو پار کرنے کی تیاری کر رہے تھے، اور اپنی زمین کی حفاظت کے لیے واپس آنے کا فیصلہ کیا۔

صحرا

صیہونی فوج نے اس کے چار بھائیوں کو اغواء کر لیا۔ انھوں نے ان میں سے تین کو فلسطین کے صحرا کا دفاع کرنے کے الزام میں قتل کر دیا جبکہ چوتھے کوانھوں نے اپنی صفوں میں بھرتی کر لیا یہاں تک کہ اس نے اپنے خاندان کو بھلا دیا،اپنے خاندان کی یاد اور اس کی اصلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکااور وہ فلسطینیوں کو قتل کر کے بدترین غداری کا مرتکب ٹھہرا۔

مگر اس نے ان لوگوں سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا جنھوں نے اس کے چار بھائیوں کو چوری کیا اور اسے صحرا میں تنہا چھوڑ دیا، نقصان اور شرمندگی کی کشمکش میں اس نے اپنی دلکش خوبصورتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نیزصیہونیوں پر گھات لگانے کے لیے، صحیح وقت پردیگر تکنیکوں کا استعمال انھیں انفرادی طور پر صحرا کے دل میں پھنسانا،اس طرح ان کے درمیان پھوٹ ڈال کر اور ان سے ہتھیاروں اور ان کے مواصلاتی آلات کو چھین کراور انھیں برہنہ چھوڑ کر صحرا میں گم کر دیا، یہاں تک کہ جانوران کو اپنی خوراک بنالیں۔ان بری روحوں کو ان پر تھوک کران کی گندگی کو صاف کریں۔

پینٹنگز گیلری

وہ اپنی ناک کے باوجود صیہونی شہریت رکھتا ہے، اس حقیقت کی وجہ سے کہ وہ صیہونیوں کے زیر قبضہ فلسطینی شہروں میں سے ایک میں رہتا ہے، اور وہ اسے اپنے استعماری وجودکا حصہ سمجھتے ہیں، لیکن اس کا دل فلسطینی ہے۔

اس نے اپنی پینٹنگز کے ذریعے فلسطین کے دیہاتوں، شہروں اور فطرت پر صیہونیوں کی طرف سے کی گئی تباہی کی نمائش کا انعقاد کیا، جب کہ کچھ بین الاقوامی اور مقامی انسانی تنظیموں نے اس کی کوششوں میں اس کا ساتھ دیا اور اس کی نمائش کے لیے فوجی اجازت حاصل کی۔

بہت سے متجسس صیہونی نمائش میں آئے۔ان میں سے ایک نے اپنے بڑے سرخ سور کے ساتھ اس کی طرف جھک کر پوچھا: "کیا تم ہی ہو جس نے یہ پینٹنگز بنائی ہیں؟''!

فلسطینی مصور نے جواب دیا: ”بلکہ تم نے اسے کھینچا ہے۔“

گھر

اس کے بڑے خاندان اورلامتناہی مہمانوں کی مناسبت سے اس کا گھر چھوٹا تھا، وہ ہمیشہ یہ خواہش کرتا تھا کہ اس کے خاندان کا اپنے وطن میں ایک بڑا گھر ہو تاکہ وہ اپنے کمرے میں اچار مچھلی کی طرح سونے کے بجائے کچھ سکون اور رازداری حاصل کر سکے۔ صیہونی قبضے کے دوران ان کے چھوٹے سے مکان پر بمباری ہوئی تووہ دائیں اور بائیں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب بغیر کسی پناہ کے گھر سے باہر نکل آئے اوراس کے بھائیوں نے اس وقت تک رہنے کی جگہ تلاش کرلی جب تک کہ انھیں پناہ نہ مل جائے۔ خود صیہونی فوجیوں نے انھیں اس سرزمین سے دور دھکیل دیا جو ان کے گھر کی یادگار ہے، لیکن اس نے صیہونی فوجیوں کے چہروں پر خوشی سے مسکراہٹ بکھیر دی کیونکہ وہ اب فلسطین کو اپنے لیے گھومنے پھرنے اور تفریح کرنے کے لیے ایک بڑا گھر بنا سکتا تھا۔ اس نے تکلیف کے بغیر خواہش کی تکمیل کی۔

ایک جملہ

اپنے گھر اور خاندان کی باقیات ایک دیوار پر اس نے چند دن پہلے لکھی تھیں جب اس کے پاس ایک گھر تھا جبکہ اس کی ماں نے اسے ڈانٹا تھا کہ اس نے پینٹ کو خراب کردیا ہے لیکن جب اس نے اس پر لکھا ہوا جملہ پڑھا تو وہ شرمندہ اور خاموش ہوگئی۔

اس نے اپنا بچ جانے والا جملہ پڑھا، "فلسطین میرا گھر ہے، اور ہم اس میں رہیں گے،"اگرچہ اس کے کچھ خطوط تقریباً غائب ہو گئے تھے کیونکہ بمباری کے نتیجے میں اس نے اپنے شہیدبیٹے کے گھر کا ایک پتھربطورنشانی لگا دیا اور اس کا کچھ خون اس جملے کے حروف کو رنگنے کے لئے لے لیا، "فلسطین میرا گھر ہے، اور ہم اس میں رہیں گے" تاکہ وہ حروف کبھی غائب نہ ہوں۔

مسجد

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مسجد میں ان کا شیخ جو انہیں قرآن کی تلاوت اور تفسیر سکھاتا ہے، وہ پہلا شخص ہوگا جسے صیہونی فوجی شہید کردیں گے، اس نے اسے براء اللہ سے بہتر دیکھا۔ شیخ نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایاتھااور اس نے اپنی زندگی رضاکارانہ طور پر نابلس شہر کے لوگوں کو تلاوتِ قرآن سکھانے میں گزار دی، حالانکہ وہ پیدائشی نابینا تھا۔

وہ صیہونی غداری کی گولی سے مارا گیا جب وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھامسجد کے قالین پر اس کے خون کے نشانات واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ شیخ نے قرآن میں سے آیت پڑھی، پھر قرآن کو چوما، اس کے بعد اسے اپنی جیب میں ڈالا،شیخ کے ناحق قتل کے خلاف اپنے ہاتھ میں اپنے غم اور پتھروں کا ڈھیر لے کر روانہ ہوئے، شاید وہ ایک کا سر جیت لے جس نے استاد شیخ کو قتل کیا۔

یکجہتی

اس کا والد اور تین ماموں بغیر کسی جرم کے اپنی نظربندی کے خلاف قابضین کے حراستی مرکز میں کھلی بھوک ہڑتال پر ہیں، اس کی پھوپھی بھی اپنے تین بچوں کی رہائی تک کھلی بھوک ہڑتال پر ہیں، وہ چاہتا ہے کہ وہ جلدی بڑا ہو جائے تاکہ اس کے تینوں چچا جیل سے رہا ہو سکیں۔ اسے یقین ہے کہ وہ اس وقت تک بھوک کو برداشت کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ بڑا نہیں ہو جاتا اور انھیں اس سے بچاتا ہے جہاں وہ ہیں۔ دشمن کے خلاف حملہ کے ساتھ جبکہ اس کا کمزور، بیمار جسم بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

پردہ

انگریز سپاہیوں نے فلسطینی انقلابیوں کا پہاڑوں میں محاصرہ کر لیا اور انہیں اپنے پڑوسی شہروں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، سپاہیوں کا خیال تھا کہ وہ انہیں آسانی سے پکڑ لیں گے۔ وہ سب فلسطینی کیفیاں پہنتے ہیں اور اپنی اصلی شخصیت کو چھپانے کے لیے، اوراپنے آپ کو مزید خطرناک بنانے اور انتقام لینے کے لیے ان سے نقاب پوشی کرتے ہیں، جہاں تک فلسطینی شہریوں کا تعلق ہے، وہ یہ کیفیاں نہیں پہنتے، بلکہ سیاہ (شارشبہ) کے ساتھ سرخ (فیز) میں گھومتے ہیں۔

سپاہیوں کامنصوبہ آسان تھااور اس کے نتائج کی ضمانت دی گئی ہے منصوبے کے مطابق ہزاروں برطانوی فوجیوں کے ساتھ فلسطینی شہروں پر چھاپے مارے جائیں گے اور تمام انقلابیوں کو ایک دن میں گرفتار کیا جائے گا توپھر ان کے خلاف ایک انقلاب برپا ہو جائے گا جب وہ انقلابیوں کو پھانسی پر لٹکا ئیں گے۔ فلسطینی شہروں میں سڑکوں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں تک پھانسی کے تختے نصب کیے گئے تھے، یہ ان کے مطابق انقلاب کی منزل تھی۔

صبح ہوئی تو انگریز سپاہیوں نے ایک ہی لمحے میں فلسطینی شہروں پر چھاپہ مارا، صرف اتنا معلوم ہوا کہ شہروں کے مردوں اور لڑکوں نے کیفیاں پہن کر اپنے آپ کو ڈھانپ لیا تھا، چنانچہ فدائین ان کے درمیان غائب ہو گئے۔ انگریز جنرل الجھ کر ان کے ہتھے چڑھ گیا اور باغی مسکرائے۔

امید

وہ مسلسل اس وقت کے انتظار میں تھا کہ وہ اس کیمپ کو چھوڑ کر گاؤں میں اپنے گھر واپس جائیں گے جب صیہونی وہاں سے چلے جائیں گے جبکہ وہ نہیں جا رہے تھے۔ وہ اس وقت شادی کرنا چاہتا تھا، جب اس کا بھائی (مصعب) صیہونی جیل سے رہا ہو جائے مگر جب تک اسے چار عمر قید کی سزا سنائی جائے گی وہ کبھی نہیں چھوڑا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے دشمنوں کے سامنے ایک پتھر اٹھایاتھا۔دوسری خواہش کہ اس کی والدہ حج پر جائیں گی جب وہ اس سال زیتون کے درخت چنیں گی، لیکن وہ اب کبھی بھی زیتون نہیں چنیں گی۔ تباہی کے دوران صیہونیوں نے زیتون کے تمام درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکاتھا۔

وہ فیصلہ کرتا ہے کہ صیہونی دشمن چلا جائے گا، اس کا بھائی جیل سے رہا ہو جائے اور اس کی ماں اس سال حج پر جائے گی، چاہے اس کے لیے کوئی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ایک بڑی بلڈوزنگ مشین جس پر وہ ایک ہاؤسنگ پراجیکٹ میں کرائے کے ڈرائیور کے طور پر کام کرتا ہے، اور وہ اس پر تیزی سے روانہ ہوتا ہے، وہ صیہونی فوجیوں کے ایک ریوڑ کوپچھاڑ دیتا ہے، اور اپنے سامنے سے بھاگنے والے فوجیوں اور وہاں موجود آباد کاروں کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔

کالا سمندر

کبھی ایسا وقت بھی آئے گا جب اس کے اہل خانہ کو غزہ کے ساحل پر پہنچنے اور اس کے صاف نیلے پانیوں میں خوشی کا وقت گزارنے کی اجازت دی جائے گی۔

آج صبح جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا گھر گندے، بدبودار پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔گندے پانی نے محلے کی گلیوں اوردوسرے گھروں کو بھی گھیرے میں لے لیا ہے جو صیہونیوں نے ان پر مزید تشدد کرنے کے لیے دوبارہ پھینکا تھا۔ گلیوں میں پھیلے گہرے سیاہ رنگ اوربدبودارتعفن سے حیران ہوتے ہوئے اس کی جوان بیٹی نے پوچھا: ”کیا ہمارا سمندر نیلا ہے۔ صیہونیوں کے لیے؟“ ماں نے بدبو سے بیزار ہو کر جواب دیا: "ہاں، یہ ان کا سمندر ہے۔''

شوق

وہ اپنے مشاغل کو اس انداز میں استوار کرنے کا عادی ہو گیاتھا جو اس کی جسمانی صلاحیتوں، مالی وسائل اور اپنے ملک کے بزدل غاصبوں سے بدلہ لینے کی ضد کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ بچپن میں چونکہ وہ دوڑ میں اچھا تھا۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر کسی بھی فٹ پاتھ پر پتھروں سے بھرا ایک تھیلا سپاہیوں کے گشت کے سامنے چھوڑ دیتا، پھر اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک بھاگتا اور اپنے چھوٹے سے تھیلے سے کانپتے ہوئے صیہونی فوجیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھتا کہ ان کی سوچ میں یہ کوئی بم ہے۔جب وہ بڑا ہوا تو اس میں جدوجہد کامزید شوق پیدا ہواکہ وہ چمڑے کی گلیل کا استعمال کرکے صیہونی فوجیوں کی آنکھیں نکالی جائیں۔ فلسطینی مزاحمت کاروں کی صفوں میں شامل ہونے کے بعد جب اس نے ہتھیار حاصل کیے تو اس کا مشغلہ یہ بن گیا کہ وہ صیہونی فوجیوں کے سروں کو چن کرنشانہ باندھے اور ہر ایک سر کو اس فلسطینی کے لیے وقف کرے جسے انھوں نے ناحق اور جارحانہ طریقے سے قتل کیا ہو۔

سرپرست

وہ اس نوجوان فلسطینی لڑکے کو ڈرا دھمکا کر تفریح حاصل کرنا چاہتے تھے جسے انھوں نے پہاڑ کی چوٹی پر اپنی چند بکریوں کو چراتے ہوئے پکڑا تھا اور اس حقیقت کا فائدہ اٹھایا کہ وہ اکیلا اور کسی مخصوص ساتھی سے بے دفاع تھا۔ انھوں نے اسے باندھا اور پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے۔اس کے بازو اور آنکھیں بندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ اس کی ہڈیوں کو توڑناشروع کردیا۔اس دوران انھوں نے ایک معصوم شہیدکو دیکھاکہ وہ اپنی قبر سے باہر نکلا، اس کے چہرے پر جنتی رنگ موجود تھا۔ اس کے چہرے کی شان و شوکت اور چمک اس کی آنکھیں اور رعب سے ان کے اوسان اڑ گئے، اور وہ اس کے پیچھے بھاگے۔ حتیٰ کہ شہیدولی اللہ کے غضب سے اپنی جان بچانے کے لیے چلائے۔

95کلومیٹر کے لیے ایک فلسطینی جمہوریہ

اس کا نام دلال المغربی ہے اور فدیہ میں اس کا نام (جہاد) ہے لیکن اس کے خواب بڑے بڑے ہیں حالانکہ اس کی عمر صرف بیس سال ہےجب اس نے فلسطینیوں کے مصائب کو محسوس کیا۔ نقل مکانی، تارکین وطن، قتل عام، کیمپوں کے عذاب، زندگی کی مشکلات، غربت، ظلم و ستم اور ناانصافی جیسے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اسی بناء پر اس نے عقیدت و احترام کے ساتھ فلسطینی پرچم کوتھام لیا، جسے وہ اپنے فوجی لباس کی جیب میں رکھتی تھی، جس سے اس کا چھوٹا، خستہ حال جسم، جو بہت پہلے بچپن کا لباس کھو چکا تھا، بے عملی کو چھوڑ چکا تھااور شکست خوردہ تھا۔اس نے اپنی نسوانیت کے ساتھ وطن کی بھٹی میں مقدس لکڑی بننے کا فیصلہ کیا، وہ طویل عرصے سے لبنان میں بہت ہی اہم فلسطینی جنگجوؤں سے تکنیکی تربیت حاصل کر چکی تھی، آخر کار وہ یہاں تک پہنچی اور اس نے اپنی نسوانیت کے ساتھ ہائی جیک کرنے والی بس کے آگے اپنے وطن کا جھنڈا لٹکا دیا۔

اب وہ اپنا خواب پورا کر رہی ہے تل ابیب کو نہیں بلکہ تل ابیب کو سولہ گھنٹے کے لیے صیہونی دشمن کی گرفت سے آزاد کروا رہی ہے اور تل الربیع کے مقبوضہ اندرونی حصے کے 95 کلومیٹر کے علاقے کے ساتھ فاتح آزاد فلسطینی جمہوریہ کا اعلان کر رہی ہے۔ ایک صیہونی بس سے جسے

اس نے اور اس کے گوریلا گروپ نے ہائی جیک کیا تھا، اس طرح صیہونی بس کے آگے فلسطینی پرچم فخر سے لہرا رہا تھا، جس نے اسے اغوا کیا تھا، اس امرنے صیہونیوں کی آنکھیں حیران کر دی تھیں جو خوف اور بزدلی سے کانپ رہی تھیں۔

وہ چلائی اوراس نے غیر معمولی شرافت کے ساتھ کہا: ”ہم تمھیں یرغمال بنائے ہوئے ہیں تاکہ اپنے قیدی ساتھیوں کو اپنے وطن پر اپنا حق مانگیں۔ جو تم نے چرا لیا ہے تمھیں ہماری زمین پر کون لایا ہے؟''!

ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں، تو وہ ایک زیر حراست صیہونی فوجی کو جو کہ یمنی نژاد ہونے کا دعویٰ کرتی ہے کو ان باتوں کا ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپتی ہے تو وہ اپنے الفاظ کا تلفظ بلند، حوصلہ مند آوازکے ساتھ دہراتا ہے: "تم میری زبان سمجھتے ہو یا زبان اور وطن کے اجنبی ہو!!!

وہ اپنے ساتھی گوریلوں کے ساتھ نعرے لگاتی ہے: "آپ سب کو معلوم ہو جائے کہ فلسطین کی سرزمین عرب ہے، اور یہ ایسی ہی رہے گی چاہے آپ کی آواز کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو اور ہماری سرزمین پر آپ کی عمارتیں کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہوں۔

میرا ملک... میرا ملک... میرا ملک۔ یہ میری محبت اور میرا دل ہے۔

فلسطین، اے ہمارے آباؤ اجداد کی سرزمین، ہمیں تیری طرف لوٹنا ہے۔"

خوف میں ڈوبی صیہونی آنکھیں حیرت سے انہیں گھیر لیتی ہیں اور وہ یقین نہیں کر پاتے کہ اس ننھی فلسطینی لڑکی نے گیارہ نوجوان فلسطینیوں کے ساتھ، جن میں ایک لبنانی اور ایک یمنی بھی شامل ہے، مقبوضہ جافہ کے ساحلوں پر اترنے کی ہمت کی تھی۔ اور تل الربیع شہر کے مرکز تک پہنچنے کے لیے وہاں ایک بس کو ہائی جیک کر کے تقریباً تیس صہیونی ریکروٹس کو ملٹری روڈ کے ذریعے جہاں چاہا جانے پر مجبور کیا، پھر انھوں نے ایک اور بس کو ہائی جیک کر کے فوجیوں کو وہاں منتقل کیا۔ پہلی بس میں اغوا شدہ فوجیوں کی تعداد اڑسٹھ تک پہنچ گئی اور انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے اسیر فلسطینی ساتھیوں کو آزاد کرانے کے لیے اپنے وطن واپس آگئے ہیں۔

اس نے بالآخر اپنے وطن کی آزادی کا اعلان کرنے کا اپنا خواب پورا کر لیا ہے، وہ اپنے وطن کے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کروانے کے بعد اپنی زندگی کے سب سے خوبصورت لمحات گزار رہی ہے، حالانکہ یہ سب کچھ ایک مختصر وقت کے لیے ہے، جو کہ اغوا کا وقت ہے۔ تل الربیع میں 95 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر نے کے بعدداخل ہوا۔

وہ اور اس کے ساتھی فلسطینی قابض دہشت گرد (ایہود باراک) کی قیادت میں صیہونی فوجیوں، ہیلی کاپٹروں اور

بھاری فوجی مشینری کے ظالم گناہگار سیاہ گروہوں میں گھرے ہوئے تھے، لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہوئے اور وہ آخری گولی تک لڑتے رہے۔ ان کے ساتھی یہاں تک کہ ان کے زیادہ تر قربانی دینے والے ساتھی شہید ہو گئے، بالآخراس کی بائیں آنکھ کے اوپر لگنے والی گولی نے اسے اپنے وطن میں ابدی نیند سلا دیا۔

اگرچہ اسے لوگوں کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے سے نفرت تھی مگراسے اپنے دشمن (ایہود بارک) کی بربریت کی پرواہ نہیں ہے، جو اسے بالوں سے کھینچتا ہے، اس کے جسم کو زمین پر گھسیٹتا ہے، اور اسے روکنے کے قابل ہونے کے بغیر غصے سے اسے گالی دیتا ہے۔ اس کی روح اپنے ساتھی شہداء کے ہاتھ پکڑتی ہے تاکہ آسمان کے فرشتے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کریں۔

وہ بلندی سے طنزیہ انداز میں مسکراتی ہے جب وہ اپنے بے وقوف دشمن کو دیکھتی ہے اب اس کی نمائندگی عالمِ بالا میں اس کے شہید جسم سے ہوتی ہے، وہ زمین کے لوگوں کو صیہونیوں سے نفرت کرنے کے لیے پکارتی ہے: "فلسطین آزاد اور عرب ہے،" تو آسمان اور زمین اس کے مقدس الفاظ کو دہراتے ہیں۔

سایہ

اسے شیڈو فینٹسی ہیرو کا کردار پسند ہے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی اس وقت گزارتا ہے جب اس کی گڑیا ناچتی ہے، لیکن وہ کبھی بھی مہم جوئی، فضیلت، جدوجہد، بہادری اور سخاوت کی زندگی میں ایک حقیقی فرد نہیں تھا۔وہ صرف اپنے کپڑوں کی گڑیوں میں رہتا ہے، جنھیں وہ مہارت اور درستگی کے ساتھ بناتا ہے۔ ان کے سنوارنے کی بے ترتیبی اور ان کے بالوں کی بے ترتیبی، وہ ہمیشہ سایہ دار کٹھ پتلیوں کے لیے ایک رقاصہ تھا،اس کے نام یا اس کی اصلیت کے بارے میں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ یروشلم شہر کے ایک کیفے میں اس نے ان کے لیے اپنے ایک شو کے لیے شام کی تاریخ کا اعلان کیا جو ان لوگوں کے پیارے ہیروز جیسے کہ انتارا، سیف بن ذی یزان، الامیرہ دات الہیمہ، الزناتی خلیفہ کی یاد میں ہے۔شو عروہ بن الورد، المحلال اور علی الزیبک اور دوسرے لوگ اس کے پاس اپنے بچوں اور جوانوں کے ساتھ اپنی خوبصورت، خوابیدہ دنیاؤں میں داخل ہونے کے لیے تشریف لاتے ہیں،حاضرین اسے کچھ سامان، تحائف اور سکے دیتے ہیں۔

لوگ محسوس کرتے ہیں کہ اس کی آواز ہیرو تھی، اس کی کارکردگی ہیرو تھی اور اس کا جذبات ہیرو کا ساتھا، واقعات کو زندہ کرنے کی اس کی صلاحیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کے اندر ایک ہیرو موجود ہے، لیکن وہ وقار کے بغیر ایک سادہ زندگی گزار رہا تھا، جس کے پاس بہت کم پیسہ

تھا۔ جب تک وہ اس فن کے لیے زندہ رہا جس سے وہ پیار کرتا تھاتو وہ اپنے ہیروز، کٹھ پتلیوں کے درمیان رہتا تھا، وہ ان کے ساتھ ایک اٹل دوستی رکھتا تھا۔

یہاں تک کہ صیہونی غنڈوں نے آکر شہر اور اس کے دیہات پر حملہ کیا اور ابتدائی طور پر القصل گاؤں پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد رہنما (عبدالقادر الحسینی) نے ان سے اسیر شدہ گاؤں کو آزاد کرانے اور ان گروہوں کو تباہ کرنے کے لیے ان کا مقابلہ کیا جو اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ پورے فلسطین میں اس نے مسلح جدوجہد کی ٹھانی مگر عربوں نے اس کی مدد کرنے اور اسے ہتھیار فراہم کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے اس نے اپنے وطن کا، اپنی عظیم مردانگی اور چند آدمیوں اور ہتھیاروں کے ساتھ دفاع کرنے کا فیصلہ کیا، پھر ہر طرف سے آزاد لوگ اس کے ساتھ شامل ہو گئے سایہ دار گھوڑا ان کے ساتھ شامل ہو گیا،حتیٰ کہ اس نے اپنی واپسی تک یروشلم کے پرانے بازار میں کیفے کے مالک کے پاس اپنے ہتھیار اور خون کو امانت میں چھوڑ دیا اور وہ (عبدالقادر الحسینی) اور اس کے آدمیوں میں شامل ہو گیا۔

آخر کار اس شیڈو مین کے لیے بہادری کا کردار ادا کرنے کا وقت آگیا کہ قبل ازیں وہ تخیل کی دنیا میں وقتاً فوقتاً جیتا رہا، لیکن وہ کبھی حقیقت میں نہیں جیا، یہاں تک کہ موت اس کا پیچھا کرتے کرتے اس کے پاس آگئی جب وہ غنڈوں کو مار رہا تھا، وہ القصل گاؤں کو صیہونیت سے آزاد ہوتے نہیں دیکھ

سکا یہاں تک کہ اس نے اس جنگ میں اپنے بہادر لیڈر کو شہید ہوتے نہیں دیکھا، لیکن اس نے آخر کار وہ لازوال بہادری کا کردار ادا کیاجس کے وہ ہمیشہ خواب دیکھتا تھا، اور اس نے اپنی زندگی کو مطمئن چھوڑ دیا تھا بغیر اس کے کہ کسی کو یہ معلوم ہو کہ اس کا نام کیا ہے یا وہ کون ہے۔

عید

اپنی زندگی کے پانچ سال تک ان کے گھر عید نہیں آئی۔ ہر سال ایک صیہونی موت واقع ہوتی ہے جو اس کے خاندان کے کسی فرد کو یا اس کے پڑوسیوں میں سے کسی کی شہادت پر منتج ہوتی ہے، اس طرح ان کے دل عید کی خوشی سے محروم ہوجاتے، وہ صیہونی فوجیوں کے محاصرے کے باوجود اپنے دروازے کھولنے کے لیے پرعزم ہے۔ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا ان پر قبضہ مسلط ہے۔ جب اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ پانچ سالہ بچہ عید کی رسومات اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا تھا، اور جب سے وہ پیدا ہوا تھا، اس نے عید کو اپنے گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ اپنے چچا (طلال) کی شہادت کی رات اس نے اپنے وقفے وقفے سے کیے گئے کام سے جو کچھ بچایا تھا اسے تعمیرات میں خرچ کیا اور رمضان کے دوران جو کچھ پورے خاندان نے ایک طویل محاصرے کے دوران روکاتھا، عید کومنانے کے لیے خرچ کیاکہ جس سے اس کے چھوٹے بھائی کا دل خوش ہو جائے۔ عید آئی، چھوٹے بیٹے کے عید کے نئے کپڑوں کو سجاتے ہوئے اور رنگ برنگے غباروں اور چمکتی ہوئی موم بتیوں سے سجاتے ہوئے ان کے پاس گری دار میوے، کھجور اور کریم سے بھرے ڈبے عید کی رونق کو دوبالا کررہے تھے۔ ایک طویل انتظار کے بعد وہ اپنے گھر پہنچااور اس کے بھائی کی روح کھڑکی سے باہر نکلی۔ جب وہ اپنی ماں کا پکاکھانا کھا رہا تھا اور وہ عید کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ آج وہ زندگی میں پہلی بار ملیں گے۔

امیدیں

اس کی ماں نے اس کا نام امل رکھا کیونکہ وہ اپنے خوابوں، امیدوں اور مستقبل کے خوف کے ساتھ پیدا ہوتی تھی۔گزرتے وقت کے ساتھ وہ اس عورت سے صلح نہیں کر پائی جس کا شوہر بوڑھا ہو اور جس کا کوئی خاندان یا سہارا نہ ہو۔ امل وہ بگڑی ہوئی بچی تھی جو عمر اور عمر کے ساتھ ساتھ جدوجہد پر یقین رکھتی تھی جبکہ اس کے والدین اسے زندگی کی سختیوں اور مشقتوں سے دوراپنی شفقت میں رکھتے تھے۔

صیہونی فوجیوں نے اسے بغیر کسی جرم کے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ سکول جارہی تھی۔ظالموں نے اس کی کتابیں اور نوٹ بک ضبط کر کے اسے بغیر کسی رحم کے ایک کارواں کے ساتھ خشک صحرا میں فلسطینی خواتین قیدیوں کے حراستی مرکز میں پھینک دیا۔ وہاں اس نے بڑا ہونا سیکھا اوراپنے آپ کو اپنی نئی ماؤں کے قابل بننے کے لیے ان کے ساتھ لاڈ پیارکا معاملہ اپنایا۔

بہت سے بین الاقوامی انسانی ہمدردی کے اداروں اور تنظیموں نے اس کی قید سے رہائی کا مطالبہ کیا ہے، کیونکہ وہ دنیا کی سب سے چھوٹی سیاسی قیدی ہے۔ مہینوں کی تکالیف کے بعد امل جیل سے باہر آئی، جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا اور حراستی کیمپ میں امل نے ایسا بہادرروپ اختیار کیاجو ایک روشن صبح سے کم کسی چیز کو قبول نہیں کرتاجو جلد ہی قوم کی امیدوں کوبرلانے والا ہے۔

شیر خوار قیدی

وہ نہیں جانتا کہ وہ اس جیل میں کس جرم میں قید ہے، جہاں نمی ہے، ناہمواری ہے، بھیڑ ہے اور بھوک ہے، اس کے آس پاس کے چہرے اداس ہیں، لیکن جینے کے لیے پرعزم ہیں اور اس کی کومل ماں کا دودھ اداسی کی وجہ سے تقریباً خشک ہو رہا ہے۔ بیماری اور کمزوری کے باعث جب وہ پیدا ہوا تھااس کی پیدائش آسانی کے ساتھ نہیں ہوئی تھی کیونکہ پیدائش کے بعد اس کی ماں کسی نارمل ماں کی طرح اسے گلے لگانے کے قابل نہیں تھی اوراس کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ اپنے نومولود کو دودھ پلانے سے قاصرتھی اور اسے جنم دیتے وقت شدید خون بہنے کی وجہ سے وہ گہری کوما میں مبتلا تھی۔

بچہ اپنی ماں سے محبت کرتا ہے اور وہ اپنے کانوں میں اس کی سرگوشی سنتا ہے جب وہ اس سے وعدہ کرتی ہے: "میرے پیارے محمد، ہم جلد ہی اس ملعون صیہونی جیل سے نکل جائیں گے، پھر تم اپنے والد جابر، اپنی بہنوں، اپنی نانی، اپنے چچا اور سب کو دیکھوگے۔ تمھارے رشتہ دار۔"

وہ ماں کی بات پر یقین کرتا ہے اوراپنی ماں کی طرح اس مایوس کن جگہ سے نکلنے کا خواب دیکھتا ہے جسے اس کی ماں صیہونی جیل کہتی ہے، اور وہ اپنے ہاتھ سے مشق کرتا ہے تاکہ جلد ہی اپنی دو انگلیوں کو فتح کے نشان کے طور پر اٹھا سکے جیسا کہ اس کی ماں ہے جو صیہونی خواتین فوجیوں

کو ناراض کرنے اور اپنی ثابت قدمی کو متزلزل کرنے میں ناکامی کی تصدیق کرنے کے لیے ان کے سامنے ایک مثال ہے۔بچے کو تاریخ کے سب سے کم عمر قیدی کے لقب پر فخر ہے، حالانکہ وہ اس عرفی نام کے معنی کو پوری طرح نہیں جانتا، لیکن وہ جانتا ہے۔ جب وہ بڑا ہو گا تو اس کا مطلب اچھی طرح جان لے گا، اور تب تک وہ اپنی ماں پر یقین کر لے گا جو اس سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ ایک دن جلد ہی اس افسردہ اور خوفناک جگہ کو چھوڑ دے گا۔

ہڑتال

کئی دنوں سے وہ اس بوسیدہ صیہونی جیل میں بغیر کسی وجہ یا مقدمے کے اپنی گرفتاری کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال پر ہے۔ اس کا جسم کمزور ہو گیا تھا اور وہ اب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا انھوں نے اسے کئی بار پلاسٹک کی ٹیوبوں کے ذریعے ہائی شوگر کے ساتھ ٹھنڈا دودھ پینے پر مجبور کیا جو اس کی ناک اور اس کے پیٹ میں اس شدت کے ساتھ داخل کیے گئے جب تک کہ وہ اس کی سانس کی نالی کو پھاڑ نہ ڈالیں اور اس کے پیٹ کو ٹھنڈے، متلی دودھ سے بھر دیاگیا۔

لیکن اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنے حراستی مراکز میں کسی بھی دوسرے فلسطینی قیدی کی طرح آہستہ آہستہ اور اذیت میں مرنے دیا جائے، انھوں نے ظلم کے خلاف احتجاج میں بھوک ہڑتال کے حوالے سے انسانی حقوق کی تنظیموں کی مہم کی بھی پرواہ نہ کی۔

صیہونی گارڈ اس کے سامنے بیٹھا مزیدار کھانا کھا رہا تھا جو نڈھال ہوتے ہوئے جسم کے سامنے پھیلا یاگیا تھا جب کہ اس کی کھال اس کے نگلنے والے کھانے کی بڑی مقدار سے چھلک رہی تھی۔

گارڈ فلسطینی قیدی کو دیکھتا ہے اور اس کو غصہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بھوک کی اذیت نہ دیکھی جائے جبکہ وہ وہی ہے جو اس کے سامنے کھانے کی لذت

ظاہر کرتا ہے۔ اس نے تجسس سے پوچھا: "تمھیں اس تلخ بھوک ہڑتال پر جانے کی کیا وجہ ہے؟! یہ حیرت انگیز ہے۔"

بھوکا قیدی اسے سکون سے جواب دیتا ہے: "تمھاری حیرت کی وجہ جاننے سے معاف کیا گیا ہے کیونکہ تمھیں وطن کی محبت کی آگ کا علم نہیں۔"

نظم

وہ شاعری لکھتا ہے لیکن اس کی ایک سطر بھی یاد نہیں کر سکتا جس سے اس کا دل چھلک رہا ہے اور اسے اپنے وہ تمام اشعار یاد ہونے چاہئیں جو اس نے اپنی محبوبہ (خدیجہ) کے لیے لکھے ہیں، کیونکہ خدیجہ پاگل ہے اور لوگ اسے صیہونی جیل میں قید کہتے ہیں۔

اسے حراست میں کاغذ یا قلم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔اس کے باوجود وہ اپنی شاعری لکھتا ہے اور اسے تمام قیدیوں میں زبردستی تقسیم کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اس شاعری کے دس اشعار یاد کرنے چاہییں، تاکہ ان میں سے کوئی بھی اپنے حفظ کیے ہوئے اشعار کو نہ بھولے، وہ ان سے پوچھتا رہتا ہے کہ کیا ان کو اس کی شاعری یاد ہے۔

اسے دیگرقیدیوں کے طنز کی کوئی پروا نہیں کیونکہ وہ اس کے کان میں اپنے حفظ کیے ہوئے اشعار پڑھتے ہیں، لیکن اس کے لیے اہم بات یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ (خدیجہ) کے بارے میں جو بھی اشعار لکھے ہیں وہ جیل سے نکلنے تک سینے میں محفوظ رہیں گے اور جیل سے نکلتے ہی وہ اس کے لبوں پر تمام اشعار انڈیلناچاہتا تھا جواس نے لکھی ہیں اور جو اس نے پہلے اس کے لیے محفوظ کر رکھے ہیں۔

کوئی اسے یہ بتانے کی جرات نہیں کرتا کہ خدیجہ کو بہت عرصہ پہلے تباہ کرنے والوں کی گولیوں نے قتل کر دیا تھا اور کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ انہیں بتا سکے کہ وہ جانتا

ہے کہ وہ واپس آئے بغیر اس دنیا سے چلی گئی ہیں اوروہ اس کی شاعری کبھی نہیں سنے گی۔اگرچہ شاعری کے ایک شعر جسے اس نے زبردستی ان قیدیوں کے سینوں میں محفوظ کر لیے تھے۔اس کی شاعری غم زدہ دل کے لیے رحمت اور اس کے جذبے کے آنسو ہیں۔

آنسو

برسوں کی خشک سالی کے بعد اچانک بارش کی طرح، فلسطینی قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ صیہونی ادارے کے ساتھ طے پانے والے تبادلے کے معاہدوں کے نتیجے میں سامنے آیا۔ منٹوں میں یہ خبرجنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور وہ انتظار کرنے والوں کے دلوں میں دھڑکتی ہے۔رہائی پانے والے قیدیوں کو لینے کے لیے وہ سب سے آگے نکل جاتا ہے، شاید اس کا باپ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک ہے۔

اس کی آنکھیں ہرقیدی کے چہرے کو تلاش کرتی پھرتی ہیں اور اس کی نظریں انتظار کرنے والے ہجوم میں اپنے رشتہ داروں کو تلاش کررہی ہیں،وہ اپنی ملاقاتی لاشوں کو گلے لگتے اور بوسے لیتے ہوئے دیکھتی ہیں۔

اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا باپ رہائی پانے والے قیدیوں میں سے نہیں ہے، اس سے پہلے کہ وہ اپنے آنسو بہائے ایک مایوسی کی لہر اس کے تن بدن کو جلا دیتی ہے کہ اس کا دکھ کسی پر ظاہر نہ ہو۔ کیونکہ وہ مرد ہے اور مرد بچپن میں بھی نہیں روتا۔

قیدی

وہ ایک صیہونی فوجی تھا، اس صیہونی جیل میں اپنی سروس کے دوران وہ نیا تھا۔ اس کے بیوقوف، چپٹے چہرے پر فلسطینی نظربندوں کی اذیتیں دیکھ کرموت کا نیلا رنگ دکھائی دیتا تھا۔

لیکن اس نے جلد ہی لوگوں کو قتل کرنے کی ہوس کا مزہ چکھ لیاتھا۔ اس کا بہت بڑا جسم ایک مونگل بیل کی طرح ہے ایک مرتبہ اس نے اپنے سر کی ایک ہی ٹکر سے ایک نوجوان فلسطینی کی جان لے لی تھی۔

قتل ہونے والا فلسطینی نوجوان جیل میں ایک بے جان لاش پڑا تھا یہی وہ ظالم فوجی شخص تھا جس نے اس کی جوانی، خوبصورتی، ہمت اور عزم سے خوفزدہ ہوکر اسے ساری زندگی قید کی دھمکیاں دی تھیں، جس سے اس میں نفرت کی لہر دوڑ گئی اور اس کے چہرے پر نفرت کے آثارتھے۔

اس دن سے وہ حراستی مرکز میں قیدی بن گیا، جہاں اس نے فلسطینی شہداء کی روحوں کے غول کو جنت اور ابدیت کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا، اسے کراہتے ہوئے چھوڑ کرظالم فلسطینی دوسری طرف چلاگیا۔

دودھ

اس نے کبھی بھی یہ توقع نہیں کی تھی کہ بچے ہونے کی امید ختم ہونے کے بعد قسمت اسے کبھی نوزائیدہ بیٹے رزکلہ سے نوازے گی اوراپنی پہلی شادی جواس کے کزن سے ہوئی تھی نے اس کے بانجھ پن کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا، پھر اس نے اپنے پڑوسی زہدی سے شادی کی۔ جس سے وہ اپنے بیٹے رضی اللہ عنہ کو جننے کے قابل ہوئیں۔

لیکن تقدیراورحالات نے اس کے خلاف سازش کی اور اسے اپنے نوزائیدہ بچے سے اس وقت محروم کر دیا جب اس نے خود کو صحرا کے ایک صیہونی حراستی کیمپ میں قید پایا،جنت کا تحفہ اپنے شیر خوار بچے سے بہت دور جو اسے ایک قیمتی امانت کے طور پر چھوڑ گیا تھااب اس کے جگر کا ٹکڑا۔ اپنے بھائی کی بیوی کی تحویل میں۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس کا بچہ ایک شیرخوار ہے جسے اس کے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جب بھی بچے کا نام لیتی ہے تواس کے لیے تڑپتے ہوئے آنسو روتی ہے، وہ اس کی جدائی کا درداپنے سینے میں محسوس کرتی ہے۔

وہ معجزات پر یقین رکھتی ہے جیل کے اپنے ڈھیلے اور گندے لباس کے اندر سے اپنی چھاتیوں کو نکالتی ہے اور اپنے شیر خوار بیٹے کے بارے میں سوچتی ہے وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے سینے سے دودھ اس کے بیٹے کے منہ میں بہتا

چلاجاتاہے، اس لیے وہ اسے اس وقت تک دودھ پلاتی ہے جب تک کہ وہ مطمئن نہ ہو جائے حالانکہ اس کے درمیان ایک صحرا، ایک جیل، فوجی اور کتے ہیں!

قیدی

اس نے گیارہ سال ایک بڑے دہشت گرد ہونے کے الزام میں صیہونی قید میں گزارے۔ چونکہ اس نے صیہونی فوجیوں کے ایک کیمپ پر چند گولیاں چلائی تھیں، وہ ایک بچے کی طرح جوش و جذبے اور شہادت کی پاکیزہ، معصوم خواہش کہ فلسطین کو غلامی کے طوق سے آزادکرائے گا وہاں داخل ہوا اور وہاں سے وہ قیدیوں کاسربراہ بن کر ابھرا۔ انھوں نے عسکریت پسندانہ نظریہ ایسا اپنایا جسے فلسطینی کاز کے لیے عربوں کی قربانیوں کا مکتب سمجھا جاتا ہے۔

جب وہ جیل سے باہر نکلا تواس نے اندازہ لگایا کہ اس کے گھر والوں اور دوستوں میں سے کسی کو بھی اس کے استقبال کے لیے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ تاکہ وصول کنندگان کا ہجوم مبارک اور فاتحانہ انداز کے ساتھ اس کا استقبال کرے اور غلامی اور شکست کے خلاف صبراوراستقامت کے ساتھ اس کی جدوجہد کا اعتراف کیا جائے۔

لیکن اس نے اپنے چند بھائیوں اور اپنے چند قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو اس کا انتظار کرتے ہوئے نہیں پایا، جن کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں سے زیادہ نہیں تھی،وہ ایک سربراہ سے ملنے کے لیے لوگوں کی عدم موجودگی پر حیران تھا۔

دوسری طرف سڑکیں لوگوں کے ہجوم سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں جو کہ ایک عرب رقاصہ کا استقبال کرنے کے لیے

شہر کے ہوائی اڈے پر پہنچ رہی تھیں،روح سے ناکارہ، اپنی ہیروئن کا استقبال کرنے کے لیے کیونکہ اس نے کھیلوں کی ایک تقریب میں صیہونیوں کے رہنماؤں سمیت کچھ عالمی صدور کے لیے تقریباً برہنہ رقص کیا تھاسانپ کے سے چلنے جیسا رقص اس بے شرم رقاصہ نے عربوں کو اپنے فن اور ان کے شفاف لباس سے انھیں محروم کرنے کی مہم میں صیہونیوں کا ساتھ دیاتھا۔

وہ تھک ہار کر الگ تھلگ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور محسوس کیا کہ وہ ابھی تک قید میں ہے۔

عید میلاد

یہ اس کی سولہویں سالگرہ ہے جبکہ اس کی خوفزدہ روح کی تہہ میں اداسی کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کوئی پارٹی، کینڈی، تحفہ یا جشن منانے والے اس کا انتظار نہیں کر رہے تھے، یہ جوانی، خوبصورتی، خواب اور خوشی نہیں تھی جو اس کے اسیر شہر میں اس کے پرانے گھر میں انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ غیر منصفانہ صیہونی قانون کا ایک ظالمانہ قانون تھا کہ فلسطینی مرد اور خواتین قیدیوں کے بچے اپنے زیر حراست باپ اور ماؤں سے ملاقات نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ سولہ سال کی عمر کونہ پہنچ جائیں۔

اب وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے والد کو دیکھنے سے محروم رہے گاکیونکہ اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے کیونکہ وہ ایک فلسطینی ہے جو اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے اپنے دشمن سے لڑ رہا ہے۔

وہ اس غیر منصفانہ فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتی ہے، وہ اپنی خوشی قربان کردیتی ہے جس کی خواہش اس کی زندگی بھر کا اثاثہ تھی وہ اپنی سالگرہ کی خواہش کرتی ہے۔حتیٰ کہ اسے بھی قربان کردیتی ہے اور وہ اپنی اگلی سالگرہ کی خواہش پوری ہونے کا انتظار کرنے لگتی ہے، پھر اس کے والد ان کے گھر کا دروازہ کھولتے ہیں تاکہ وہ اس کی سالگرہ کا جشن منائیں۔

ننگا

وہ ایک قدیم مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور اس نے اپنے بچپن سے ہی قرآن حفظ کیا ہے اورخود کو کبھی کسی مرد کے سامنے ظاہر نہیں کیاخواہ کوئی بھی ہو وہ اپنے آپ کو ڈھانپے رکھنے کے لیے دن رات دعا کرتی رہتی ہےوہ ایک مشہور صوفی حکم کی سربراہی کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ واحد آدمی جس کی اس نے کبھی بیوی بننے کی امید کی تھی، اس کو ایک مظاہرے کے دوران ایک صیہونی گولی سے قتل کر دیا گیا۔ اپنے خاندان کے گھر کی گہرائیوں میں ایک خول میں بند پوشیدہ رہ رہی ہے۔

لیکن اب وہ صیہونی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بالکل برہنہ کھڑی ہے چونکہ انھوں نے اسے ایک شہادتی آپریشن میں گرفتار کیا جو ناکامی پر ختم ہوا، اور اس پر طرح طرح کے تشدد کی کوششیں کیں حتیٰ کہ اس کے اصرار اور برداشت سے انہیں جو کچھ حاصل ہوا، وہ آخر کار اس نے حاصل کیا۔ ایک ظالم صیہونی فوجیوں کے ایک ریوڑ کے سامنے ایک شرمیلی مسلمان عورت کو برہنہ کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا، ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اسے برہنہ کریں گے تو اس کی روح کو شدید کوفت ہوگی اور اس کا قابلِ فخر ہونے کا اعزاز ہمیشہ کے لیے خاک میں مل جائے گا۔

وہ ان کے سامنے برہنہ کھڑی تھی،اس کی روح نے شرم وحیا کی چادر اوڑھ رکھی تھی اور اسے صیہونیوں کی خنزیرنما

آنکھوں کی پرواہ نہیں تھی، جو اسے اذیت دینے میں اس کے جسم کو انتہائی حد تک کھا گئی تھیں۔ اسے اپنے سامنے زمین پر چرنے والے انسان نما کے سامنے اپنی برہنگی پر شرم نہیں آرہی تھی۔

دل

صیہونی جیل کے ڈائریکٹر جنرل نے نوجوان حریت پسند فلسطینی قیدی کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اپنے صیہونی بھائی کوجو برسوں سے بستر پر پڑا ہے اور جو دل کے عارضے میں مبتلا ہے اس کے لیے ایک صحت مند دل کی ضرورت ہے اس کا بھائی اپنے ناکارہ دل کی بجائے اپنے سینے میں لگانا چاہے تاکہ وہ زندگی اور امید دوبارہ شروع کر سکے۔

جب سے اس نے اس نوجوان فلسطینی قیدی کو کوہ حبرون سے آتے ہوئے دیکھا، جسے اپنی صحت، تازگی اور سرگرمی پر ناز تھا، اس نے خواب دیکھا کہ اس کے دل پر حملہ کرکے اسے اس کے سینے سے چیر کر اپنے بھائی (باروخ) کے دل میں لگا دے۔

آخرکار اس نے اپنا خواب پورا کیا اور فلسطینیوں کا دل اس کے مالک کے سینے سے چرا لیا، جس طرح اس نے پہلے فلسطین اور اس کے عوام کو اس کے محفوظ اور پرامن لوگوں سے چرایا تھا۔

فلسطینی نوجوان کو اس بہانے سے دفن کیا گیا کہ وہ ایک دہشت گرد ہے اور اس کی موت کے بدلے میں کسی گوریلا کارروائی کے خوف سے اس کی لاش اس کے اہل خانہ کے حوالے نہ کی گئی۔ تل ربی شہر کے صہیونی ہسپتال، جسے وہ

(تل ابیب) کہتے ہیں، کا عملہ چوری شدہ دل کے آنے کے بعد دل کی پیوند کاری کے لیے چوکس تھا۔

سب کچھ چور صیہونی جنرل کے منصوبے کے مطابق ہوا اور اس کے بھائی کے جسم نے چوری شدہ دل کو خوش آمدید کہا اور چند دنوں کے بعد ایک شرمندہ زندگی نے اس کے بھائی کے گالوں کو ڈھانپ لیا جو مختصر کوما کے بعد بیدار ہوا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فلسطینی لڑکے کے دل کو اس کے زنگ آلود، عیب دار دل سے بدلنے کے لیے پیچیدہ آپریشن کیاگیا۔

چور جرنیل اور اس کے ارد گرد موجود تمام لوگ اس نوجوان صیہونی کو دیکھ کر مسکرائے جو ایک فلسطینی دل کے ساتھ زندگی کی طرف لوٹا تھا۔

جنرل نے بے چینی سے اپنے بھائی سے پوچھا: "میرے پیارے بھائی باروچ، کیا آپ خیریت سے ہیں؟"

نوجوان صیہونی نے اس بات پر حیرانی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا: "میں باروچ نہیں ہوں، میں یہاں کیوں ہوں کہ مجھے مسجد ابراہیمی میں نماز ادا کرنے کے لیے جانا پڑے گا؟"

سپرم

ایک نطفہ ہی تھا جس نے محرومی، اجنبی، جلاوطنی، جیلوں اور باڑوں پر فتح حاصل کی، پولیس کے ایک جدید منصوبے کی بدولت جب علاج کرنے والی ایک ڈاکٹر نے ویکسینیشن ہسپتال میں اپنے فلسطینی قیدی شوہر سے اسمگل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

نطفہ کی اسمگلنگ طریقہ بالکل قدیم تھا، اس کے گھر والوں اور اس کے گھر والوں کے گواہوں کی موجودگی کے ساتھ تاکہ کوئی اس کی عزت کی توہین نہ کرے، اب وہ حاملہ تھی جب کہ اس کا شوہر برسوں قید میں اس سے غائب تھا۔ دور دراز صحرائی جیل میں۔

نطفہ سے علاج کرنے والے معالج کے مردہ ہاتھوں میں پہنچ گیا، سوائے چند ایک کے جنھوں نے پانی کی کمی کے باوجودمزاحمت کی اور جمنے کے انتظار میں زندہ بچ گئے، پھر جب ان کو وہاں منتقل کیاگیا تو اس کے رحم میں زندگی اور فرٹلائجیشن کا تجربہ ہوا۔

آخر کار ایک بہادر نطفہ حمام نے موت پر فتح پائی، اس کے رحم میں زندگی سے ہاتھ ملایا، اور اس کا جنین (عمار) بن گیا، جو صیہونی جیل سے اسمگل ہوکر زندہ ہوا، اپنے اسیر باپ کا نام لے کرایک وعدہ کے ساتھ کہ وہ نہیں مرے گا بلکہ جینے کے اس عزم کے ساتھ کہ وہ فلسطینی پرچم کو بلند کرتے ہوئے اپنے والد کا جھنڈا اٹھانے کے لیے خود کو وقف کر دے۔

اب اس کی ماں (سعود) اپنی زندگی میں سب سے زیادہ خوش ہے وہ اسے اٹھائے ہوئے صیہونی فوجیوں کے سامنے گھومتی ہے جنھوں نے اس کے شوہر کے اس کے لیے دروازے بند کر رکھے تھے، لیکن وہ اسے باپ بننے کے خواب سے محروم نہیں کر سکے تھے۔

وہ اپنے شوہر کی طرف فتح کی مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتی ہے، اور اپنے بیٹے (عمار) کوخیالوں ہی خیالوں میں اس کی طرف بڑھاتی ہے تاکہ وہ اس کی پیشانی پر ایک ہوائی بوسہ دے سکے اور اسے امید ہے کہ یہ بچہ ایک مضبوط آدمی ہو گا۔ وہ بہادر آدمی جو جیل کے دروازے پر اس کا انتظار کرتا ہے جب اس کی سزا ختم ہوتی ہے، اور جب وہ تقریباً ایک چوتھائی صدی کے بعد وہاں سے نکلتا ہے، تو وہ اس کے بڑھاپے پر نرمی سے اس کی گردن تھپکتی ہے، اور اسے گھر لے آتی ہے۔ جہاں اس کا بیٹااس کا انتظار کر رہا ہے۔

اسیر کے نغمات

کیمپ ڈویژن

وہ جوان تھا اور اسے راستے اور منزل کا علم نہیں تھا جب اس کے والد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ اسے اس کے بھائیوں کے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔1948 کے نقبہ کے بعد اس نے اپنے گھر میں تھوڑا سا فرنیچر جمع کیا تھا۔ جب اس نے اپنے والد سے پوچھا۔، "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس کے والد نے پریشان ہوکر مختصر ساجواب دیا، "ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

اب وہ اپنے جڑواں بیٹوں سے اپنے آپ کو 1967 کے خونی واقعات کے پیش نظر انھیں عجلت اور بزدلانہ طور پر کیمپ سے فرار ہونے کے لیے گھسیٹ رہا ہے۔؟''!

وہ ایک روہانسی مسکراہٹ مسلسل تلخی کے ساتھ جواب دیتا ہے: "ہم اس وقت تک کیمپ نہیں چھوڑتے جب تک کہ ہم نئے کیمپ میں نہ جائیں۔''

تھیم ہل

اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ موت کے نتیجے میں لوگوں پر حملہ کرنے کی یہ وحشیانہ شکلیں ہوسکتی ہیں، تال الزاطر کیمپ پر حملہ کرنے والے گروہوں نے فلسطینیوں کو کسی جرم بغیر جرم کے قتل کرنے کے انتہائی خوفناک طریقے ایجاد کیے، سوائے اس کے کہ وہ اس پر حملہ کر رہے تھے۔ انھوں نے خالصتاً سیاسی وجوہات کی بنا پر کسی کو ختم کرنے کا ایجنڈاتیارکررکھا تھا۔

وہ اب موت کی مختلف شکلوں کی پرواہ نہیں کرتی، وہ ان راکشسوں سے نہیں ڈرتی جن کے ظلم وستم کے باعث وہ اپنے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کو ختم کر چکی ہے۔ اپنی ماں اور بہنوں کو پیاس سے مرنے کی جدوجہد میں پانی کا ایک ایک قطرہ حاصل کرنا اسے یاد ہے۔اسنائپرز کی گولیوں اور غنڈوں کی گولیوں کے نیچے پانی کا ایک جگ لانا ناممکن ہو گیا تھا، پانی کے کنویں ان فلسطینی شہداء کے خون سے بھر گئے تھے جو اپنے اہل خانہ کے لیے پانی لانے کے لیے پُرعزم تھے۔

وہ پانی کے ایک ایک جگ سے اپنی جان کی شرط لگاتی ہے، خطرہ مول لیتی ہے اور اپنے دکھی دل کو سنائپرز کی نظروں سے چھپا لیتی ہے، وہ کیمپ کے لوگوں اور شہیدوں کی لاشوں سے ٹھوکر کھاتی جاتی اور پانی کا جگ لے کر واپس آتی ہے۔ گھر کے دروازے پر ایک سنائپر نے اس سے پانی کا جگ

”شہید“کر دیا اور اس کا پانی گرم زمین پر گرا دیا گیا پیاسی زمین نگل پانی نگل جاتی ہے۔ وہ زمین پر بیٹھ کر شہید کے لیے پانی کے برتن پر روتی ہے اور کچھ پانی اپنے ہاتھوں میں ڈالتی ہے اس سے پہلے کہ وہ اس کی انگلیوں سے ٹپک کر دوبارہ زمین پر آجائے۔

حنظلہ

اسے اپنے والدین اور دادا دادی سے دکھ وراثت میں ملے تھے، جیسے اسے جلاوطنی کی زندگی ان سے وراثت میں ملی۔ وہ کیمپ کی زندگی اور اس کی ذلت کے ساتھ اپنے آپ پر ظلم کرنے کا عادی ہو گیا اور اس نے سوچا کہ قسمت نے اس کے بڑے بھائی کا ساتھ دیا ہے، جسے باپ کا کردار وراثت میں ملا تھا۔ ان کے والدجنھیں بیماری اور مشقت سے کچلا گیا تھا یہاں تک کہ ان کے ساتھ ایک لاش کی طرح سلوک کیا گیایعنی جسم کے بغیر لاش۔

وہ ایک چھوٹا گودام بنانے کے قابل تھاجسے وہ کیمپ سے دور ایک گھر کہتا تھا، شہر کے ایک دور دراز علاقے میں جہاں وہ ایک پناہ گزین کے طور پر رہتا تھا، اس نے اپنی ماں، بھائیوں، بیوی اور اپنی بیوی کی ماں کوساتھ لیاجو اس کے ساتھ رہتے تھے اور پھر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو کیمپ اسکول سے اس دور دراز علاقے کے اسکول میں منتقل کر دیا۔

سکول کے طلباء اس کا مذاق اڑاتے رہے حالانکہ وہ اس سے بہتر لباس پہنے ہوئے تھے اور نہ ہی خوبصورت تھے، لیکن وہ اس کے خلاف اتحاد کرتے تھے۔ اس کا مذاق اڑانا اور کیمپ میں رہنا اور اس کے فلسطینی ہونے کے بارے میں اس کی توہین کرنا۔

اس نے اپنے جوتے اتارے ان کی طرف پیٹھ پھیر لی اور ان کی موجودگی کی کوئی پرواہ نہ کی اورنہ ہی ان کی توہین کا جواب دیا یا اپنے مستند فلسطینی لہجے پر شرمندہ ہوا، اس نے دیوار پر بلیک بورڈ پر لکھا: "ہنڈالا اب ناراض ہے۔"

تصویر

اس کی ماں سوائے اس تصویری کتاب کے جسے وہ اور اس کے تین بچوں نے پالا تھا، کیمپ سے کچھ بھی نہیں لے کرگئی تھی جس پر صیہونیوں اور صیہونی عربوں کے اکٹھے قیدیوں نے حملہ کیا تھااور اسے امید نہ تھی کہ وہ کیمپ کے قتل عام سے بچ جائیں گے اوراسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں سے بچنا ہے، اور نہ ہی اسے اپنے بچوں کو ایک نئے قتل عام سے بچانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے،کہ یک لخت اس کی ایک گولی نے اسے مار ڈالا، اور اسے تلاش، فرار، اور اس کے سوالات سے نجات دلائی۔

کیمپ کے قتل عام میں صرف اس کی سب سے چھوٹی بیٹی اور اس کی تصویری کتاب بچ گئی، جس میں اس نے اپنے خاندان کے ہر فرد کی تصویر رکھنے کے اپنے شوق کو عملی جامہ پہنایا، گویا وہ انھیں موت،ظلم وستم اور ناپید ہونے سے بچا رہی ہے اگر وہ ان تصاویر کواپنے سامنے رکھیں۔ کتاب، جو اس نے اپنے گھر آنے والے ہر شخص کو دکھائی اور تفصیل سے بتایا کہ ہر تصویر کا مالک کون ہے۔وہ ان کی زندگی، فطرت اور ان کے کردار کے بارے میں بات کرتی ہے، چاہے وہ شخص چاہے یا نہ چاہے۔ اس کی تصویروں کے مجموعے کی نمائش کے لیے اس کا جوش و خروش اسے تصاویر دیکھنے والوں اور ان کے بارے میں گفتگو سننے کی خواہش شدت پکڑتی جارہی ہے۔

چھوٹی بیٹی ایک ہفتے سے کیمپ کے مضافات میں کھوئی ہوئی تھی، جب وہ چلتے پھرتے تھک گئی تو نالے کے کنارے اُگی ہوئی گھاس میں چھپ گئی اور نوٹ بک میں تصویریں پھاڑ کر بیٹھ گئی۔ کیمپ کے قتل عام میں ان کے تمام مالکان کے مارے جانے کے بعد وہ صرف اس کی خون آلود تصویر تھی، جسے اس نے اپنی جیب میں ڈالا، اور اس سے پہلے کہ وہ لاغرہوجائے، پناہ یا مدد کی تلاش میں دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ وہ حرکت کرنے سے قاصرتھی اور اس جگہ اکیلی موت کے ہاتھوں نڈھا ل ہورہی تھی، کیونکہ وہ زندہ رہنے کا عزم کر رہی تھی۔

چکن

اسے موت، جھڑپوں، تشدد اور تصادم سے ڈر لگتا ہے، اس لیے اس نے کبھی بھی صیہونی دشمن کے خلاف مزاحمت میں حصہ نہیں لیا، اور ایک بزدل فارمی مرغی کی طرح زندگی بسر کرتا رہا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے لوگوں کے دوران حراست صیہونیوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے اور پھینکے جانے سے نہ بچ سکا۔

اس کا منصوبہ یہ تھا کہ بزدلی پر اپنا عقیدہ برقرار رکھتے ہوئے وہ جیل سے بحفاظت نکل نہ جائے لیکن جیسے ہی اسیر فلسطینی گوریلوں نے اسے تعلیم دینے کا عہد کیا، انھوں نے اسے فلسطینی ہونے کے لائق ایک مضبوط حقیقی آدمی بنا دیا۔

وہ جیل سے نکل کر سڑکوں پر اپنے دشمن کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنا سر اٹھایا تھا، اب وہ مرغی کی طرح زمین پر چونچ لگانا پسند نہیں کرتا تھابلکہ اس نے کانٹوں کی طرف ایک خالص نسلی عقاب کی طرح دیکھنا شروع کردیاتھا۔

دوڑنا

وہ ایک دوڑتا ہوا آدمی ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی تین سالہ لڑکی کو گلے لگاتا ہے مگر جس سے وہ ملتا ہے اسے سمجھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ کسی سے بات کرنے سے انکار کیوں کرتا ہے۔ اگر وہ یہ راستہ اختیار کرتا ہے تو اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے لوگوں سے بہت دور ہے پھربھی وہ اس وقت تک دوڑتا رہے گا جب تک کہ وہ ہانپتے ہانپتے آرام نہ کرسکے اور اپنے بازوؤں کا محاصرہ توڑنے پر راضی ہوجائے۔ جس کا چہرہ، حرکات و سکنات اور بولی مدہم نہ پڑجائے۔

اس نے جدہ اور یہاں کے درمیان اس جنونی دوڑ میں کئی کئی دن گزارے،جس طرح کہ اس کی روح برداشت کر سکتی تھی،جیسا کہ دکھ اور خوف اور یرموک کیمپ میں مردہ فلسطینیوں کی تصویریں دیکھ رہا تھا، جہاں اس نے لوگوں کی بدترین شکلیں دیکھی تھیں۔ بھوک، پیاس، بیماری، اداسی اور خوف سے بھرپورتصویریں۔

وہ بزدلی کی وجہ سے کیمپ سے نہیں بھاگا، بلکہ اپنی بیمار بیوی اور سات چھوٹے بچوں کی ہمدردی سے بھاگا، لیکن وہ انھیں آوارہ گردی، اڑان، بے گھری، بھوک، پیاس اور سردی کی گھٹن سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ وہ فرار ہونے کے راستے میں اس سے لاپتہ ہوتے جارہے تھےجب انھیں ان کی فلسطینییت کے جرم میں دروازے سے پیچھے دھکیل دیا گیا۔

بالآخر وہ یورپی جنگل میں اس چھوٹے سے دریا تک پہنچ گیا، جیسے اس ملک میں پناہ گزین کے طور پر اترنے کے لیے اسے ایک آخری چیز عبور کرنا تھی۔

موسم ٹھنڈا ہے اور اس کے پاس اس جنگل میں ضائع کرنے کا وقت نہیں ہے، اور اس کی جوان بیٹی بیماری، بھوک اور سردی سے تقریباً مردہ ہوچکی ہے، اس نے اسے وہاں لے جانے کا فیصلہ کیا جہاں اسے زندگی کا موقع ملنے کی امید تھی جبکہ دریا کا پانی اس کے مطابق ٹھنڈے سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہے۔

بالآخر وہ دوسری طرف پہنچتا ہے اپنے بچے کو زمین پر رکھتا ہے، اس کی سانسیں چیک کرتا ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور اس کے پاس بے جان لیٹی ہے۔

میٹھا

وہ اس سے لبنان کے عین الحلوہ کیمپ میں ملا جب اس نے اس کے ساتھ اپنے نرم لبنانی الفاظ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تو اس نے اسے فلسطینی تکبر کے ساتھ جواب دیا۔ جو اس کے غرور کو ٹھیس پہنچانے کا متحمل نہ ہو سکا اگرچہ اس نے اسے لعن طعن کی لیکن وہ اس سے مانوس ہو گیا۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی تعریف کی جبکہ اس کی خوبصورتی اس کے ہتھیاروں کے پیچھے چھپ گئی جس کا اسے یقین تھا۔

اپنی فوجی وردی میں جسے فلسطینی گوریلا کے بچے پہنتے ہیں، وہ نسوانیت اوراپنے نرم ونازک جسم کو چھپاتی ہے، اگر وہ ہتھیار نہ رکھتی، تو وہ پھولوں کی ٹوکری لے کر چاولوں کے کھیتوں میں اس کے ساتھ مزے کرتی۔اس لیے اس نے اسے (میٹھا والا) کہا۔

اس نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی وہ اس کے نرم و ملائم چہرے کا مذاق اڑا رہی تھی، لیکن وہ اس پُراسرار ظاہری نرمی کے پیچھے مضبوط مردوں کی سی سختی دیکھ رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی محبت کا کھلم کھلا مذاق اڑا رہی تھی۔ اسے اس خوبصورت، سنہرے بالوں والے آدمی پر فخر تھا جو اس سے پیار کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک بچہ پیدا کرنے کے لیے پرعزم تھا، بالکل اس کی ضد اور اس کے دلیرانہ جذبے کی مانند۔

لیکن اس نے اسے دھوکہ دیا اوراپنے امور کی فرائض کی بجاآوری کے لیے چھوڑ دیا اور فلسطین میں مسلح جدوجہد کے لیے چلی گئی۔ اس کے اس سے دور رہنے سے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اکبر کی محبت کی قیدی ہے، اس نے اپنا ہتھیار اٹھایا اور اس کے پیچھے چلنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ وہ اس سے ایک بہادر اور ضدی بچہ پیدا کرنے کا عزم کر رہا تھا۔

عائشہ علوان

بچے اس پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کی پسندیدہ استاد ہیں جس نے یرموک کیمپ میں زیادہ تر بچوں کے لیے رنگ اور کاغذات خریدے تھے، کیونکہ وہ اپنی غربت کی وجہ سے ان کے لیے ادائیگی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دنیا میں رہنے کے برعکس زندگی بچوں کے لیے خوبصورت اور خوشیوں سے بھری ہوئی ہے۔

وہ اس پر یقین کرتے ہیں، اور اس کے وعدے پر بھروسہ کرتے ہیں کہ جیسے ہی وہ کیمپ میں کچھ کھانا اور طبی امداد لے کر آئے گی تو ان سے ضرور ملے گی اس لیے وہ اب تک اس کے واپس آنے کا انتظار کر رہے ہیں، لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔

انھیں معلوم ہوا کہ کیمپ کے دروازے پر متحارب فوج نے اسے یرموک کیمپ میں خوراک اور ادویات کی اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا، جس کا کافی عرصے سے محاصرہ کیا گیا تھا، یہاں تک کہ وہ درجنوں بار اس سے پہلے مر چکی تھی۔اب کی باروہ آخری موت مر گئی تھی۔

وہ کیمپ میں واپس نہ آسکی اوراس طرح اپنے طالب علموں سے اپنا وعدہ وفا نہ کرسکی جو اس سے محبت کرتے ہیں اور اسے مس (عائشہ علوان) کہتے ہیں، لیکن وہ اس کی موت کے خیال سے انکار کرتے ہیں اور وہ اس کی روح اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔وہ اسے اسکول کی دیوار پر ایک تازہ

مسکراہٹ کے ساتھ، سامان اور دوائیوں سے لدی ان کے پاس پلٹتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور وہ اس کا انتظار کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے ساتھ اپنی ملاقات کا وعدہ کبھی نہیں توڑتی۔

فلسطینی

وہ اپنے اوپرروارکھی جانے والی اذیت کا کوئی جواز نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ جب وہ جوان تھا تواسے پتہ چلاکہ اس کا وطن چوری کر لیا گیا ہے کیونکہ جب وہ بڑا ہوا تو اس کے باپ کی جوانی کے پھولوں پر بمباری ہوئی۔ وہ اپنے اور اپنے خاندان کی روزی روٹی کا شکار ہو اکہ وہ فلسطینی تھاجبکہ اس کا دایاں پاؤں تباہ ہو گیا تھا اور اس کے خاندان کے پاس اس کے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے کیونکہ وہ فلسطینی تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ایک ناپاک ٹین کیوب میں گزاری، وطن کی سرحدوں کے پیچھے کیچڑ، بدبودار علاقے میں انتظارکرتے کرتے اسے "مصلوب"کیا گیا کیونکہ وہ فلسطینی تھا۔

جب وہ بڑا ہوا تو اس نے غمگین رہنا، بھوکا رہنا، ننگا ہونا اور اپنے لوگوں کے قتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا سیکھا کیونکہ وہ فلسطینی تھا! اس کی یادداشت شہداء، میت، لاپتہ، جلاوطن، نظر بند اور غیر حاضروں سے بھری ہوئی ہے جن کی واپسی ملتوی کر دی گئی ہے کیونکہ وہ فلسطینی ہیں۔

جب خواب اسے چھوڑ کر چلے گئے تو اس نے اپنے جانے کی کوئی پرواہ نہیں کی کیونکہ وہ فلسطینی تھا اور وہ شرم سے رونا چاہتا تھا کیونکہ کیمپ انتظامیہ نے اس کے چھوٹے سے اسٹال کو اس بہانے سے ضبط کر لیا تھا کہ اس نے کیمپ کا مہذب چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ اس رونے پرشرمندگی نے اسے ڈانٹا کیونکہ وہ اس کے لائق نہیں تھاکیونکہ وہ فلسطینی تھا۔

فخر

گھر میں اس کا بنیادی کام اپنے بھائی کے کالے، پالش شدہ جوتے اٹھانا ہے، جنھیں بڑے بیٹے کے لیے اہتمام سے خریدا گیا تھا جوکہ حکومت میں ملازم ہے اورخیال رکھا گیا تھا کہ اس کے رکھ رکھاؤ اور عزت میں فرق نہ آئے۔

یہ سب سے بڑا بیٹا پورے خاندان کے لیے زندگی کی لکیر ہے، پورا خاندان اس کی محدود آمدنی پر پل بڑھ رہا تھاوہ اپنے بوڑھے باپ کو کیمپ کے مضافات میں گندم کی منڈی میں ایک بار پھر بچارہا تھا۔

بڑا بھائی اپناواحد کالا سوٹ اور پرانے بھورے جوتے پہنتااور چوڑے تیز قدموں کے ساتھ، مور کی طرح اُڑتے ہوئے چلتا ہے اور اس کے پیچھے چھوٹا بھائی احترام اور فخر سے اس کے جوتے اٹھائے چلتا ہے۔

جب وہ کیمپ کے قلب میں واقع ٹرانسپورٹ سٹاپ پر بس کے پاس پہنچتے ہیں تو اس کا بڑا بھائی اپنی ایک سیٹ پر بیٹھتا ہے، اپنے پرانے کیچڑ والے جوتے اتارتا ہے، بس کی کھڑکی سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیتا ہے اور صاف کالے جوتے اپنے چھوٹے بھائی سے لیتا ہے اورانھیں پہن لیتا ہے۔ اس طرح جوتے کیچڑ سے محفوظ رہتے ہیں۔

چھوٹا بھائی خوشی سے گھر لوٹتا ہے کیونکہ اس نے خاندان کی تقدیر سنوارنے کا اپنا بنیادی روزمرہ کا کام پورا کر لیا ہے اگر اس کا بڑا بیٹا کام کرتا رہے گا تو کیا وہ بھوکے مرے گی کیونکہ وہ اسے نوکری سے برخاست کر دے گا۔ کیمپ کی کیچڑ سے داغے ہوئے ہیں؟

کیمپ

وہ اس بار اس کیمپ کو نہیں چھوڑے گی، چاہے اسے پوری دنیا سے لڑنا پڑے، ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں پناہ لیناس کی زندگی کا ایک سلسلہ ہے۔ اور ہر کیمپ میں، اس نے اپنے خاندان کے کچھ افراد کو کھو دیا یہاں تک کہ اپنے دو بچوں اور شوہر کی گوریلا یونیفارم اور فرنیچر کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ تنگ ہونے کے باوجود اس کے گھر کے کمرے کو مزید تنگ کردیاگیا۔

اس نے اپنے دو بچوں کی زندگیوں کو بچانے کے لیے تمام محرومیوں اور ظلم و ستم کو قبول کیا، اور اب وہ لوگ کیمپ پر مزید حملے کر رہے ہیں تاکہ قتل، بے گھری اور عصمت دری کے سلسلے میں فلسطینیوں کے خون بہانے کا جشن منایا جا سکے۔ اس وقت وہ یہ نہیں جاننا چاہتی کہ حملہ آور کون ہے، اسے اس کے نام، مذہب یا اس کی قومیت، زبان، مقصد یا سوچ کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ سب ایک جیسے ہیں جب وہ ایک فلسطینی کو مارتے ہیں۔موت کاخود اس کے ساتھ اتحاد ہے اور وہ جو بھی ہووہ اسے مار ڈالے گی اس نے ٹھان لیا کہ وہ نہ صرف اپنے بچوں کا دفاع کرنے والی فلسطینی ماں ہوگی بلکہ اپنے شوہر کی وردی اور حملہ آوروں کے خلاف کیمپ کا دفاع کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائیگی، وہ چاہے کوئی بھی ہو وہ اس جہنمی کھیل میں اپنے دو بچوں کو مرنے نہیں دے گی۔

وہ اپنے گھر اور کمرے کا دروازہ اپنے دو بچوں پر بند کر دیتی ہے اور باہر نکلنے والوں کے ساتھ کیمپ کا دفاع کرتی ہے، وہ اپنے بچوں اور اپنی دھرتی ماں کے بچوں کی حفاظت کرنے کے لیے اس کی سرحدوں پر جرات سے لڑتی ہے۔ جولوگ اپنے گھروں میں پھنس گئے وہ شام کواپنے گھر لوٹتی ہے تودیکھتی ہے کہ وہ کمرہ ان لوگوں کے خون سے رنگین ہوچکاہے اس سب کووہ ایک دھماکے سے برداشت کرتی ہے، اسے اپنے دو بچوں کا انتظار ہوتا ہے۔ وہ انھیں دروازے کے پیچھے خون میں ڈوبا ہوا دیکھتی ہے کووہیں زمین پر گرتی ہے، انھیں اپنے سینے سے لگاتی ہے اور ان کے ساتھ رونا شروع کردیتی ہے۔

کارڈ کی فراہمی

نوجوان لڑکا گرمیوں کی تعطیلات میں کام کرنے کے لیے پُرعزم ہے تاکہ شاید اس کپڑے کے تھیلے کی بجائے پتلون، ایک قمیض اور چمڑے کا تھیلا خریدنے کے لیے کچھ پیسے کمائے جو ماں نے اس کے لیے ان کپڑوں سے سلائی کیے تھے جو پرانے ہو چکے تھے اورجنھیں باربار دھونے نچوڑنے اورسکھانے سے اس کی ماں عاجزآچکی تھی۔ اس نے کیمپ میں کام تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ دبلے پتلے جسم اور چھوٹے قد والے چھوٹے بچے کو کوئی بھی ملازم نہیں رکھنا چاہتا، اس لیے اس نے کیمپ سے باہر کوئی ایسا کام تلاش کرنے کا فیصلہ کیا جو اس کے چھوٹے جسم کے لیے موزوں ہواور جو تنگ کرنے، جدوجہد کرنے، بھاگنے یا دھکیلنے کے قابل نہ ہو۔

اس نے اپنی ضرورت کچھ دکانداروں کے سامنے پیش کی لیکن انھوں نے اسے ٹھکرا دیا یہاں تک کہ وہ ایک بوڑھے، نیلی آنکھوں والے سوداگر سے ملا،نوجوان نے اس سے التجا کی کہ وہ اس کیمپ سے ایک فلسطینی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ شاید اسے نوکری مل جائے بشرطیکہ وہ ہمدردی کے ساتھ اس کی طرف توجہ دے اور اسے کام کی ضرورت کی حد تک سمجھائے، تاجر نے ماننے سے انکار کیا کہ وہ فلسطینی ہے، بہرحال ایک طویل بحث کے بعد لڑکے نے اپنے آپ کو فلسطینی ثابت کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہ وہ فلسطینی تھا تاکہ وہ اس سے کوئی نوکری حاصل کر سکے جب تک کہ کسی

نـامعلوم وجـہ سـے، اس کـی فلسـطینییت کـی تصـدیق مـیں وہ دلچسپی رکھتا ہو۔

لڑکے نے فون اٹھایااور جلد از جلد اپنے گھر سے "سپلائی کارڈ"منگوایا تاکہ تاجر کو ثابت کیا جا سکے کہ وہ فلسطینی ہے، کیونکہ اس کے پاس اس کی اصلیت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دوسری دستاویز نہیں،اس نے ہانپتے ہوئے، تھکاوٹ، جوش سا تناؤ اور کامیابی کے حصول کی امید پر کارڈ سوداگر کوپیش کیا۔سوداگر نے کارڈ حقارت کے ساتھ اسے واپس کردیااوراسے ایک جھٹکے سے زمین پر دھکیل دیا۔ حقارت سے کہا: "یہ ثابت کرتا ہے کہ تم ایک فلسطینی بھکاری ہو، چلو، میرے لیے کوئی کام نہیں ہے۔"

لڑکے نے زمین سے کارڈ اٹھایا،اس کی روح زخمی زخمی تھی،اس نے کارڈ پر اپنی دائیں گرفت مضبوط کر لی تاکہ وہ اسے کھو نہ دے، اس طرح اس کے گھر والوں کے لیے اپنا ماہانہ سامان ضائع ہو گیا، اس نے واپس جانے کے لیے اپنی ٹانگیں ہوا میں گھسیٹنا شروع کردیں اپنے گھر کی طرف تاکہ تاجر اس کے آنسو نہ دیکھے اور اس پر خوش ہو جائے۔

سزا

وہ اپنے اسکول کی پرنسپل سے خصوصی اعزاز حاصل کرنے کی توقع کر رہی تھی جہاں وہ ملک کی سطح پر شاعری کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر آنے کے بعد پڑھاتی تھی۔وہ وہاں ایک پناہ گزین کے طور پر رہتی ہے جب اسے اور اس کے خاندان کو ان کے ساحلی فلسطینی شہر سے نکال دیا گیا تھا۔

تاہم، ڈائریکٹر ایک بے وقوف لومڑی کی طرح لگ رہا تھااورتعصب اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا،وہ اس کے پاس آئی تو اس نے نفرت سے پوچھا: "کیا تم واقعی فلسطینی ہو؟"

چھوٹی لڑکی نے محسوس کیا کہ شاید اس پر جرم کا الزام لگایا ہے جس کا ارتکاب اس نے نہیں کیا تھاہکلائی ہوئی سوچ نے اسے اپنے اوپرلگائے گئے الزام کی تردید کرنے کی ہمت بخشتی۔ "لیکن میرے پاس قومیت ہے"!...

پرنسپل نے اپنے سینہ کو متکبرانہ انداز سے آگے بڑھایا۔ اس کی چھاتیاں ایک کھارے پانی کی کھال کی طرح بہت بڑی اور جھکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، پرنسپل نے اس سے کہا: "اے گستاخ، اس اسکول کو چھوڑ دو اور اپنے سرپرست کے علاوہ اس میں واپس نہ جانا۔"

وہ پرنسپل کے کمرے سے باہر نکل گئی، اسے یقین نہیں آیا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے جب اس کے فلسطینی نژاد ہونے کا

جرم ثبوت اور کھلے اعتراف کے ساتھ اس کے خلاف ثابت ہو گیا تھا۔

گھر واپسی کے سارے راستے وہ خدا کا شکر ادا کرتی رہی کہ اس کے پرنسپل کو پتہ نہیں چلا کہ وہ کیمپ میں رہ رہی ہے،ورنہ وہ اسے اس گھناؤنے جرم کی سزا دینے کے لیے اسکول کے دروازے پر ہی سولی پر چڑھا دیتا۔

لوازمات

UNRWAکا ایک نمائندہ کیمپ میں پرائمری اسکول کے طالب علموں کو بھوک پر قابو پانے کے لیے عیش و آرام کی چیزوں کو چھوڑنے کے بارے میں ایک لیکچر دے رہا تھا۔ تمام لذیذ کھانے اور کینڈی، گوشت اور دیگر پکوان جن کا وہ نام نہیں جانتے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنے کیمپ کی زنگ آلود تاریخ میں بھی انھیں نہیں دیکھا۔

وہ ندامت اور تڑپ کے ساتھ ان پکوانوں کی تصویروں کی پیروی کرتے ہیں، جیسے وہ اپنی بھوک کے سامنے کسی مندر کے ٹائلوں پر قربانی کے رقص کی طرح دکھائے جاتے ہیں، پھر وہ ہٹے کٹے نمائندے او ر کیمپ اساتذہ کے حکم سے لیکچر کے صحن میں ان سے دور چلے جاتے ہیں۔ اپنی بھوک پر قابو پانے کے لیے، اس بہانے سے کہ وہ پرتعیش ہیں، اور وہ ان سے سویا آئل سے غذائیت سے متعلق پکوان تیار کرنے کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنتے ہیں، کیونکہ وہ ان کے لیے ضروری غذائی اجزاء میں سے ایک ہے۔

وہ سفید ڈسپلے والی دیوار پر اپنے سامنے آویزاں عیش و عشرت کی تصویروں کو بے بسی سے گھورتے رہتے ہیں اور خاموشی سے خواہش کرتے ہیں کہ کاش وہ یہ آسائشیں حاصل کر لیں۔

بھی

یرموک کیمپ میں ان لمحات میں صرف موت ہی اس کا انتظار کر رہی ہے، وہاں کوئی کھانا، پینا، سلامتی، نجات دہندہ، گرمی، دوائی یا فرار کا راستہ نہیں ہے، اس کے ارد گرد بکھرے ہوئے لوگ اورملبہ ہے۔ ہر جگہ موت کے سپاہی کیمپ کے دروازوں پر ان کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں اور سیاہ ہاتھ جسے چاہیں اغوا کر لیتے ہیں اور شام میں اقتدار کے لیے لڑنے والوں کے حراستی مراکز کے عذاب میں موت تک دفن کر دیتے ہیں۔

وہ نہیں جانتا کہ اس کا کیمپ متحارب اور جھگڑالو لوگوں کے منہ میں کیوں ایک لقمہ بن گیا ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کیمپ میں وہ فلسطینی چہرے بھی تھے جن سے وہ پیار کرتا تھا، موت نے اس وقت تک اس کا تعاقب کیا جب تک ان کی زندگیوں کو تباہ اور ان کی امیدوں کو برباد نہ کر دیا۔

اس محاصرے کے دوران اس کی ماں دوا کی کمی کی وجہ سے مر گئی اور اس کی بہن کے دو بچے، جو اس کے شوہر کی موت کے بعد سے ان کے ساتھ رہ رہے تھے، غذائی قلت کی وجہ سے مر گئے، اور اس کی محبوبہ (زینب) کو رات کے وقت متحارب سپاہیوں نے اپنے ساتھ اٹھا لیا اور اُنھوں نے اُسے فجر کے وقت کیمپ کے سامنے اُس حالت میں پھینک دیا جیسے اُس کے کپڑے اور زندگی کی سانس چھین لی گئی ہو۔

ہر کوئی شدید پیاس کا شکار ہے، کیونکہ کیمپ میں کئی دنوں سے پانی نہیں ہے شدید گرمی ہے، بارش نہیں ہو رہی ہے کہ وہ اپنی پیاس بجھائیں۔

وہ اپنے لیے مرنے کا راستہ اختیارکرتا ہے کیونکہ کیمپ کا محاصرہ کرنے والے راکشسوں کی طرف سے پابندیوں کے باعث وہ اب اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد نہیں ہے اور وہ اپنی مرضی سے کوئی راستہ اختیار نہیں کرسکتا وہ اس تباہی میں چلا جاتا ہے جو اسے گھیر لیتی ہے،وہ اپنے پسندیدہ وائلن کو لے جاتا ہے، جسے اس نے عطیات کی ایک مہم سے خریدا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ اسے خود سیکھنے اور سکھائے جانے والے کچھ اسباق کے ذریعے اس فلسطینی موسیقار سے ملا جس کے پاس ڈینش شہریت ہے جب وہ برسوں پہلے کیمپ کا دورہ کرنے آیا تھا۔

وہ اپنے اداس وائلن پر کھیلنا شروع کر دیتا ہے اور اس وقت تک بجاتا رہے گا جب تک کہ پیاس اس کے اندر سے خون کا آخری قطرہ تک چوس لے، یہ وہ موت ہے جسے وہ سنتا ہے اور اسے سنتے سنتے ہی مر جانا ہے۔ وہ بغیر رکے پورے تین گھنٹے اسے بجاتا ہے، بجھنے والے آسمان میں اپنی موسیقی کے ساتھ بلند ہوتا ہے اور کیمپ کے لوگ اس کے ساتھ آسمان پر چڑھتے ہیں اور اچانک، دن کے گرم ترین اوقات میں بارش ہوتی ہے۔!

نہر البرید

اس کے خواب، اس کی زندگی، اس کے برسوں کے عذاب اور اس کی جلاوطنی سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے منہدم ہو جاتا ہے جب لبنان کے نہر البرید کیمپ میں اس کے گھر پر بمباری کے بعدجو منظراسے نظر آتا ہے۔ جوکچھ ہو رہا ہے کا خلاصہ دو الفاظ ہیں: سازش اور دھوکہ۔

اس نے اپنی زندگی میں صرف اپنے خاندان، اپنے دو بھائیوں اور اس کی بیمار اسپنسٹر بہن کے گھرانے کے لیے چار منزلہ سرخ اینٹوں کا گھر بنانا تھا۔

اس کی دنیا، اس کی کوششیں اور اس کی زندگی کے کئی سال اس کے گھر کے گرنے کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سمٹ رہے ہیں۔ وہ ایک لنگڑے پاؤں کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہے، یہ معذوری برسوں سے اس کے ساتھ ہے، وہ اپنے سگریٹ پینے لگتا ہے اور ایک نیا گھر بنانے کے لیے کسی ممکنہ منصوبے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے کیونکہ وہ کبھی نقصان کو قبول نہیں کرتا۔

خانہ بدوش کے نغمات

رہائش

چند دنوں میں عرب ممالک کے اس گرم اور دور افتادہ شہر میں اس کا رہائشی اجازت نامہ اور اس کے چھ بچوں کی رہائش کی سہولت ختم ہو جائے گی، جہاں وہ اسے غیر ملکی کہتے ہیں، اور وہ غیر ملکی کو شہری کہتے ہیں۔

اسے دنوں میں اس شہر اور ملک سے باہر جانا ہے۔ یہاں، وہ ایک بھی ایسی فلسطینی خاتون کو نہیں پہچانتے جس کے رہائشی اجازت نامے کی میعاد ختم ہو چکی ہے اور جو برسوں سے اپنی فلسطینی شناخت کھو چکی ہے، جس کی وجہ سے وہ فلسطین میں اپنے شہر میں رہنے کے لیے واپس جا سکتی ہے، وہ برسوں پہلے اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور کام کرتی تھی۔اب یہ شہراحساس ندامت اور ایک ویران اور مردہ روح کے ساتھ ہوکررہ گیا ہے۔

اس کے شوہر کا دو ماہ قبل دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ اس نے اس شہر میں برسوں کی محنت اور ذلت کے بعد اپنے غم کے آگے ہتھیار ڈال کر کام کرنا چھوڑ دیاتھا۔اس شہرنے اس کی جوانی، خاموشی، خوابوں اور عزت کو بغیر کسی رحم کے جذب کر لیاتھا۔

اس نے اپنے رہائشی اجازت نامے کی تجدید کی امید میں شہر کے تمام دروازے کھٹکھٹائے، کیونکہ اگر وہ یہ شہر چھوڑ کر چلی جاتی تو اس کے لیے اس دنیا میں رہنے کی کوئی جگہ

نہیں تھی۔ لیکن اس کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلا اور نہ ہی وہاں کوئی اس کے لیے مہربان یا ہمدرد جگہ تھی۔

اس نے اپنے بیگ اور اپنے چھ بچوں کو پولیس کے کسی بھی چھاپے سے نمٹنے کے لیے تیار کرلیا تھاجو اسے اپنی آخری رقم خرچ کرنے کے بعد سرحدوں سے باہر پھینک سکتے تھے اب وہ جبری روانگی کا انتظار کر رہی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ وقت کب آئے گا۔ وہ موت کی طرح اس کا انتظارکررہی تھی اور جب بھی اس کے چھ بچوں میں سے کسی نے اس سے اپنے سفر کی منزل کے بارے میں پوچھا، تو وہ اسے گلے لگاتی، اور بلند آواز میں، بے قابو ہو کر غائب ہو جاتی حالانکہ اسے یقین تھا کہ عورت کی آواز شرمناک ہے۔ اس نے الجھن اور تکلیف میں بچے سے کہا: "مجھے نہیں معلوم کہ ہمیں کہاں جانا چاہیے۔"

سمندر

وہاں، یرموک کیمپ کے ایک تنگ راستے میں،الگ تھلگ اپنے چھوٹے سے گھر میں سمندراس نے ہمیشہ سمندر کو دیکھنے کا خواب دیکھا تھاوہ سمندرکی چمکیلی نیلی سطح پر اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بحری جہاز میں گھومتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھنا چاہتی تھی۔جہاز اور اس کے خاندان کے ساتھ سمندر کا سفر اس کی روح میں شامل،اس کے خواب تھے، جو اس کیمپ سے دور فاصلوں، بلیوز اور ایک وسیع آسمان کے لیے تڑپتے تھے۔ یہ کیمپ اپنے بڑے رقبے کے باوجود ہجوم اور بھیڑسے تنگ ہورہا تھا۔

شام کی خانہ جنگی نے اس کے گھر اور یرموک کیمپ کو تباہ کر دیا، اس کے تمام لوگوں کو بے گھر کر دیا، اور اسے اور اس کے خاندان کو زبردستی بے گھر ہونے والے لوگوں کے ہجوم میں شامل کیا جو اپنی جانیں لے کر بھاگ رہے تھے اور اس جنگ میں وقت کے بعد ان کی کتنی ہی عزتیں ضائع ہوئیں کیونکہ وہ کمزور تھے اور کچھ نہیں.

یہاں اب وہ بے گھر فلسطینیوں سے بھرے جہاز پر ہے، یہ ایک غیر قانونی تارکین وطن کا جہاز ہے، اور یہاں سمندر ان کے جہاز کو بغیر کسی رحم کے مار رہا ہے، اس کا بادبان پھاڑ رہا ہے، اور اسے بے قابو ہو کر نگل رہا ہے۔ بغیر کسی مدد یا مدد کے جہاز میں سوار افراد سے گھبراہٹ اور چیخنا۔

سمندر نے اس کے بچپن کے خوابوں کو دھوکہ دیا، اور اب اسے اس تکلیف دہ فریب کا پتہ چل گیا، اور یہ اسے نگلنے کے لیے اس پر حملہ کر رہا ہے جس طرح اس نے جہاز کے بہت سے مسافروں کو اس کی آنکھوں کے سامنے نگل لیا تھا، وہ اس کی مزاحمت نہیں کرتی، اور دعا نہیں کرتی مدد، بچاؤ، یا معجزہ کے لیے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے اور اسے اپنے سر سے جلد بازی میں لے جاتی ہے۔ وہ اب بھی سمندر سے پیار کرتی ہے چاہے وہ اسے دھوکہ دے اور دھوکہ دے۔

تھپڑ

ایک بار پھر، اس کے پڑوسی اس کے بیٹے کے بارے میں شکایت کرنے آتے ہیں، وہ اسے اس جگہ پر لے جاتے ہیں جہاں وہ بطور کارکن کام کرتا ہے، اس کے شرارتی چھوٹے بیٹے کے خلاف بدنیتی پر مبنی الزامات کے بارے میں زبانی درخواست کے ساتھ، جس نے - ایک بار پھر - ان کے ایک بیٹے کو مارا۔ باپ بہت غصے میں ہو جاتا ہے، اور وہ اس لوہے کی طرح سرخ ہو جاتا ہے جو اس نے ابھی پگھلنے والی بھٹی سے نکالا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اسے اور اس جیسے دوسرے لڑکوں کو اس کی وجہ سے مارتا ہے۔ اس لڑکے نے اس پر ایک بار پھر یہ کہہ کر تنقید کی کہ وہ فلسطینی پناہ گزین ہے۔

اس کا باپ اسے ایک تھپڑ مارتا ہے جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل جاتی ہیں تاکہ وہ اس لڑکے پر خوش نہ ہو جو اس پر لگائی گئی ہے۔ وہ غصے میں، نفرت انگیز نظروں کے ساتھ ان کو رخصت کرتا ہے، اس کے والد اسے تقریباً الگ کرتے ہوئے اسے کندھے سے کھینچتے ہیں، اور اس سے دوبارہ پوچھتے ہیں: "کیا اس نے واقعی تمہیں پناہ گزین کہا تھا؟!"

"اور کتیا کے بیٹے کا بھی خیال رکھنا۔"

"کیا تم نے اسے تکلیف سے مارا؟!"

- "میں نے اسے مارا۔"

- "بہت خوب، میرے بیٹے، خدا تمہارے داہنے ہاتھ کو سلامت رکھے۔"الرّسام

مچھلی

وہ ایک فلسطینی ماہی گیر تھا جس کو سمندر اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا تھا، جس طرح اس نے اپنی کشتی، اس کے جال، اس کی کہانیاں، اس کی خرافات، اس کی مچھلیاں، اس کے سمندر، اس کے جوار اور اس کے جزیرے وراثت میں حاصل کیے تھے، لیکن صہیونیوں نے اسے گم کر دیا۔ زمین، بندرگاہوں، سمندروں، سمندروں اور بحری جہازوں پر دستک دیتے ہوئے، غزہ کے سمندر کی تلاش میں، جب انہوں نے اسے اور بہت سے ماہی گیروں کو اپنے پہلے پانی کے سفر میں ان سے ناراضگی کے ساتھ ملاقات کی، لیکن اس نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ زندگی کے پانی سے باہر مچھلی بنی رہی۔

اس نے خود کو غزہ کے سمندر سے دور نہیں پایا اور وہ فلسطینیوں کی مسلح مزاحمت میں شامل ہو گیا، اور کچھ گوریلوں کے ساتھ چپکے سے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ سمندر وہ تھا جس نے اپنے وطن سے سب سے پہلے اپنی آنکھوں کو ہلا کر تمام سمندری ہواؤں کو نگلنے کے لیے اپنے پھیپھڑوں میں سانس لیا اور یہ کہہ کر سانس خارج کی: "اوہ، غزہ کا سمندر!"

تبادلہ

چونکہ اسے فلسطین سے زبردستی بے گھر کیا گیا تھا اور اس نے وہاں واپس آنے کا خواب دیکھا تھا، اس لیے اس کی پوری زندگی کے منصوبے اس ناخوشگوار منصوبے کی تیاری کے گرد گھومتے تھے، حتیٰ کہ اس کی اس غیر ملکی سے شادی بھی اس لیے ہوئی تھی کہ اس نے فلسطینی کاز کے لیے اس سے وسیع تر ہمدردی ظاہر کی تھی، اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ مکمل طور پر اس کی حمایت کرے گی۔ اس نے اس ملک میں جو پیسہ جمع کیا وہ سمندر، پہاڑ اور میدان ہیں جو اس کے وطن واپس آنے کے لیے تھے، اس نے اسے فلسطینی بننے کے لیے بنایا تھا۔ ماں، اور اس منحوس، بہادر اور بہادر بیٹے نے اسے ایک اچھے بیج کے طور پر تیار کیا تاکہ وہ دوبارہ اپنے وطن کی مٹی میں بوئے۔

اس نے اپنی بہت بڑی دولت کا نصف، جو اس نے لکڑی کی تجارت سے حاصل کیا تھا، غدار صہیونیوں کو رشوت کے طور پر ادا کیا تاکہ اس سے کئی سال قبل اس سے چھینے جانے کے بعد اس نے اپنی باقی آدھی دولت ادا کی۔ اپنی پردیسی بیوی کو خوش کرنے کے لیے، جس نے اپنے دانتوں کو ننگا کیا اور اس دنیا کے کسی بھی جائز مقصد پر پیسے کو ترجیح دی، اس نے اسے پوری رضامندی کے ساتھ ادا کیا تاکہ وہ اسے ان کے دونوں بیٹوں کی تحویل میں دے، اور وہ اس پر راضی ہوگئی۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس نے رقم لے لی، اور وہ اپنے دو فلسطینی بیٹوں کو ان کے وطن واپس لے گیا، کیونکہ وہاں ایک مقدس مشن ان کا انتظار کر رہا تھا۔

سفید جوتے

صیہونی غنڈوں کے اس کے گاؤں پر چھاپے کی رات، وہ کئی دنوں تک اپنے گھر والوں سے گم رہی کیونکہ اس نے اپنے نئے سفید جوتے پہننے کے لیے ان کے ساتھ فرار ہونے میں تاخیر کی، جسے خریدنے کی خواہش سے اس کا دل دھڑک رہا تھا، اور وہ۔ لمبے مہینوں تک خواب دیکھا، اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی ماں کو مجبور کرنے کے لیے زبردست جنگیں لڑیں، خونی آنسوؤں اور دلائل کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ اس پیارے سفید جوتے کو قربان نہ کرتی، خواہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے لوگوں کے پیچھے پڑ جائے گی، جو تباہی، قتل و غارت اور عزت کے نقصان سے ڈرتے ہیں، اور وہ وہ تھی جو پہن کر اپنے پاؤں پر کنجوس تھی۔ تاکہ وہ تھکے نہ جائیں۔

اس نے ڈر کے مارے اپنے خاندان کو سرحدی کیمپوں میں مشکل میں پایا، اور بے رحم چڑھنے کی دھوپ میں سڑک کے کنارے پڑے تھکے ہوئے گوشت کے ڈھیروں کے درمیان راستہ تلاش کرنے والے ہاتھوں سے اسے نچوڑ لیا گیا۔ .

چالیس سال گزر چکے ہیں اور وہ اپنے جوتے پہنے بغیر نہیں سویا ہے، چاہے وہ سفید ہو یا نہ ہو، اس ڈر سے کہ اس کے گھر والوں سے دوبارہ محروم ہو جائے، یا پسندیدہ جوتے کی وجہ سے اس کا خاندان اس سے محروم ہو جائے۔

کرایہ پر لینا

وہ اپنے بوسیدہ فلسطینی لباس میں میدان میں گھومتی ہے، وہ واحد خاتون تھی جو صہیونی حملے کے ہولوکاسٹ سے بچ گئی تھی جس نے اس کے گاؤں کی سرزمین پر حملہ کیا تھا، اس نے ان سے ان کی زندگیوں، ان کی عزتوں، ان کی روزی کا معیار چھین لیا تھا۔ ان کی برادری کا پیار، اور انہیں دنیا کے راستے پر کھوئے ہوئے پناہ گزینوں کے طور پر پھینک دیا، اب وہ اس پتلی، پھٹی ہوئی بھیڑوں کے کھیت میں ٹماٹر چننے کا کام کرتی ہے، اور سینے جو پیٹ کی طرف بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی پسلیاں خشک اور اسے دیکھنے والوں کی نظروں کے لیے ذلت آمیز، دو ٹانگوں پر کھڑی سڑی ہوئی لاش ہے۔

اس ذلت آمیز کام سے وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے معذور شوہر، اس کی بوڑھی ساس اور اپنے بہت سے بچوں کے لیے روٹی، صاف پانی اور کچھ سبزیاں اور چاول محفوظ کرے، وہ اپنی آنکھوں سے بیل کی طرح طلوع آفتاب سے غروب تک کام کرتی ہے۔ ایک ملعون پانی کے پہیے سے بندھا جو کبھی نہیں رکتا جبری پناہ نے اسے اپنی عزت محفوظ رکھنے کے ساتھ ایک غریب، بے سہارا پناہ گزین کو اس بات کا خوف ہے کہ ایک دن اسے نوکری سے نکال دیا جائے گا، اور اس کے شوہر، بچے اور۔ ساس بھوک سے مر جائیں گی۔

وہ لاش، زمین کا مالک، اپنی چند پیسوں کی قیمت کے طور پر اس کے ماتھے کے پسینے اور اس کے جسم کی محنت پر

قبضہ کرنے کے علاوہ، اس کی عزت کو تباہ کرنا چاہتا ہے، وہ دن رات اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ، اور اسے کسی بھی طرح سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ ایسا کرنے سے انکار کر دے۔ اسے تسلیم کرو، خواہ اس کا پورا خاندان اپنی عزت کے دفاع کے لیے بھوک سے مر گیا ہو، کیونکہ یہ فروخت کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی کسی کی جان کی قیمت ہے۔

ابن شہید

وہ اپنی کلاس میں سب سے پہلے ہے، لیکن وہ اسے اپنے آپ سے حسد سے دور کرتے ہیں، جو ان سے زیادہ ذہین اور قابل ہے، اور جو اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے اساتذہ کا پیار اور احترام، صرف ایک سال پہلے اس اسکول میں آیا تھا، اور اس کے باوجود، وہ اسے اپنے اسکول میں داخل ہونے کے بارے میں کہانیوں سے چھیڑتے ہیں، ان میں سے کچھ اسے مفرور کہتے ہیں۔ اس کو پناہ گزین، اور زیادہ ظالم اور سخت دل گروہ اسے بھکاری کہتا ہے، لیکن وہ خاموش رہتا ہے اور ان کی توہین کا جواب کسی قسم کی توہین سے نہیں دیتا، اس لیے وہ اس کی توہین کرنے میں زیادہ سے زیادہ ظالم ہو جاتے ہیں۔

اس کے لیے ان کی نفرت بھر گئی، اور وہ اس کا انتظار کر رہے تھے جب وہ اپنے پرانے اسکول کے تھیلے کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا، اور انھوں نے اسے مارا، بے عزت کیا۔ اس سے اس کی قمیض پھاڑ دی، جو کہ اس کی واحد غیر پہنی ہوئی قمیض تھی، وہ اپنے آنسو نہیں روک سکا کیونکہ اس سے اس کے غضبناک چھوٹے حملہ آوروں کے سامنے اسے مزید ذلیل کر دیا جائے گا، اس نے اسے صاف نہیں کیا، بلکہ ان کی طرف دیکھا۔ اور ان کے مارنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: میں ایک شہید کا بیٹا ہوں۔

خیمہ

دادی نے اپنی پوتیوں کو فلسطینی جلاوطنی کی کہانیاں سنانے کا تہیہ کر رکھا ہے تاکہ وہ اپنی اصلیت، اپنے مقصد اور اپنے لوگوں کے دکھوں کو نہ بھولیں، سب سے پُرجوش ننھی پوتی نے تلخی سے دادی سے پوچھا: "کیوں، میری دادی؟ ان تمام کہانیوں کا انجام جو آپ ہمیں سناتے ہیں، فلسطینی اپنا گھر کھو بیٹھے، اپنی زمینوں سے بے گھر ہو گئے، وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے اور رہنے پر مجبور ہو گئے... کہیں خیمہ؟

دادی خاموش رہتی ہیں، اور اس معصوم سوال کے پیچھے چھپا ہوا خوف محسوس کرتی ہیں، اور وہ خوف اور رازداری کے ساتھ اپنے آپ سے پوچھتی ہیں: "کیا پھر سے کوئی اور خیمہ کسی اور جگہ اس کا انتظار کر رہا ہے؟"

وہ جلاوطنی، جلاوطنی اور جلاوطنی کے خیمے سے دور ایک پرامن موت کی امید رکھتی ہے، اور اس ملعون شیطان سے پناہ مانگتی ہے جو اس لعنتی خیمے میں اسے وسوسہ دیتا ہے۔

فلاسک

وہ اپنے فلسطینی کاز کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہے، اور وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتی ہے کہ اس کی ماں کی طرف سے اس کے یورپی آدھے حصے نے اس کے والد کی طرف سے فلسطینی آدھے کو چھایا ہوا ہے، لیکن وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا باپ، جس سے وہ پیار کرتا ہے۔ بہت، اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونے کا خواب دیکھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس کی لاش کو فلسطین میں دفن کیا جائے لیکن وہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

اس کی ماں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بے بسی کے سامنے ہتھیار ڈال دے، اپنے باپ کو یورپی شہر کے قبرستان میں دفن کر دے اور اس ضد کو معاف کر دے جس کی قیمت اسے بغیر کسی نفع کے پڑی، لیکن اس نے اپنی آخری خواہش اور اپنی کھوئی ہوئی زندگی کا خواب پورا کرنے کا عزم کیا۔ جلاوطنی کے غم میں اس نے اس کی لاش کو ایک شمشان گھاٹ میں جلا دیا، اس کے لیے اس نے پوری عزت کے ساتھ اس کی راکھ کو ایک بوتل میں رکھ کر، ایک یورپی سیاحوں کے قافلے میں فلسطین کا سفر کیا، اور دفن کرنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بوتل کی راکھ فلسطین کی مٹی میں، تو اس کے والد صہیونیوں کے باوجود اپنے وطن کی مٹی میں واپس آگئے۔

بوڑھا ہونا

اس کی عمر سو سال سے زیادہ اور دس سال سے زیادہ ہے لیکن وہ اب بھی اپنے گھر لوٹنے کا انتظار کر رہا ہے جسے وہ شمالی فلسطین میں اپنے پہاڑی گاؤں میں (الالی) کہتا ہے، اس جگہ اس کی زمینی جنت معلق ہے۔

اس نے اپنے بچوں یا اپنے خاندان میں سے کسی کو بھی اس "الالی" میں اپنی زندگی کے بارے میں نہیں بتایا جہاں وہ دولت مند، فرمانبردار اور سب کا مالک تھا۔ وہ اپنے کھوئے ہوئے فخر کو اپنے سینے اور یادوں میں دفن کرتا رہا جب اس نے ذلت کو نگل لیا اور اپنے بیوی بچوں کو پکڑ کر موت کے منہ سے بھاگنے کے بعد وطن سے باہر چند پیسوں کے لیے کرائے کے ہاتھ کا کام کیا۔

وہ اپنی جدوجہد کے دوران ڈیمنشیا میں گر گیا تھا، اور اس کے ارد گرد سینکڑوں بیٹے، بیٹیاں، پوتے اور رشتہ دار تھے اور وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا رہے تھے، بھوتوں کی باتیں سن کر جسے اس نے "البلاد" میں "العالی" میں اپنے گھر میں دیکھا، جیسا کہ اس نے فلسطین کہا۔

انہیں امید تھی کہ اس کا جھگڑا زیادہ دیر تک چلے گا تاکہ وہ اپنے ڈیمنشیا سے زیادہ لطف اندوز ہوسکے۔ انہوں نے پہلی بار اسے دل سے ہنستے ہوئے دیکھا، وہ اپنی بے فکر، خوش گوار زندگی کی تفصیلات بتا رہا تھا، اور اپنی دوسری بیوی (سارہ) کے لیے اپنی محبت کے باب بیان کر رہا تھا۔ زندہ، اس سے

باتیں کرنا اور ادب و احترام سے ہاتھ ملانا، اور اسے (سید العالی) پکارنا۔

آخر کار، موت نے ان کے دادا (کید الصالح) کی پلکیں بند کر دیں، جو طویل جدائی کے بعد فلسطین کے پہاڑوں میں اپنے خوبصورت گاؤں (الالی) میں واپس آئے۔

آواز

بہت دور، سمندروں، سمندروں، پہاڑوں اور میدانوں کے پیچھے، جہاں اس کے دادا اور والد کو چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا، اور ان کے بعد اسے، انہوں نے اسے جھوٹی، بہتان اور بے وقوفی سے سکھایا کہ لفظ گولی مارتا ہے، اور یہ کہ آواز سچائی توپ کی آواز سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔

اس نے بہت کچھ بولا، مزید لکھا، اور اپنے فلسطینی عوام کے کاز کا دفاع کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کی، لیکن اسے جلد ہی پتہ چلا کہ اسے سننے کے لیے کوئی کان نہیں ہیں، اور کوئی دل یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

تمام پیک شدہ اور ختم شدہ خیالات کو ترک کرنے کے یقین کے ساتھ جو اجنبیوں نے اسے سکھائے تھے، اس نے اپنی پوری بچت سے وہ ہتھیار خریدے جو اسے خریدنا تھے، اور اپنے وطن فلسطین کے لیے روانہ ہو گئے، جہاں ہتھیار ہی وہ ہیں جن کے ذہن میں سستی، بہرا پن، یا بیماری ان کے کانوں میں سن سکتے ہیں.

خوش قسمت لڑکا

بھوکے گرے ہاؤنڈ کی طرح دبلے پتلے ایک سنہرے بالوں والے آدمی نے اس لڑکے کے کندھے پر تھپکی دی جس نے سفاک صہیونی فوجیوں کے ہاتھوں اپنے فلسطینی خاندان کے افراد کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا، پھر اس نے اپنی گھنگریالے بھیڑوں کے بالوں کو سجایا اس نے نرمی پیدا کی، اور ایک صحافی سے کہا جس نے چمڑے کی ایک چھوٹی نوٹ بک میں اپنے الفاظ درج کیے تھے: "بے گھر ہونے والے فلسطینیوں کے لیے امدادی عملے کے سربراہ کے طور پر: میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لڑکا بہت خوش قسمت ہے، کیونکہ وہ بچ نکلا ہے۔" موت جبکہ اس کے خاندان کو پلک جھپکتے میں ذبح کر دیا گیا۔

صحافی نے جلد بازی میں پتلے سنہرے بالوں والے آدمی کے الفاظ ریکارڈ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے قلم نے اس کی بات نہ مانی، اس لیے وہ کبھی بھی لفظ (خوش قسمت) نہیں لکھ سکا، اس کے بجائے اس نے (مصیبت) کا لفظ لکھا اور قلم نے پھر کچھ لکھنے سے انکار کردیا۔ دوسرا لفظ جیسے ہی وہ خاموش انسانیت کی شرم سے درگاہ میں داخل ہوا!

ایک لائن

صبح سویرے سے ہی سورج بے دردی سے ذلت کی قطاروں میں ان کا انتظار کر رہا ہے، امدادی کارڈز کے مطابق ان کے لیے تقسیم کیے جانے والے سامان کی وصولی کا انتظار کر رہا ہے تاکہ انھیں مرنے سے بچایا جا سکے، اور انھیں مسلسل تکلیف میں قید کر دیا جائے جو کبھی نہیں ہو گی۔ اختتام

وہ بہت بڑا کمینے ان کو کوڑے سے مارتا ہے تاکہ وہ انہیں لڑکھڑانے سے روکے، اور تھکی ہوئی عورتوں، بھوکے بچوں اور مردوں کے کسی بھی ہجوم کو منتشر کر دے جو جلد سے جلد اپنے بھوکے بچوں تک اپنا کھانا پہنچانے کا خواب دیکھتے ہیں۔

جب وہ اسے دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھی عورت اپنے کوڑے سے نماز پڑھتی ہے تو وہ اس پر اس طرح حملہ کرتا ہے جیسے اس پر پہاڑ گرتا ہے، اس کا کوڑا اتار دیتا ہے اور اسے اس سے مارتا ہے یہاں تک کہ اس کا خون بہنے لگتا ہے، چنانچہ وہ اس سے مدد لینے لگتا ہے۔ اس کے آس پاس کے لوگ بغیر کسی سہارے کے۔

اس کے منہ سے نکلتا ہوا تھوک اس کے گلے کو ٹھیک کر رہا ہے: ”تم اسے کیوں مارتے ہو، ہم انسان ہیں، ہمیں تمھارا کھانا نہیں چاہیے۔ہم عزت کے ساتھ مرنا چاہتے ہیں۔''

وہ اس جگہ سے چند قدم دورچلا جاتا ہے، یہ سوچ کر کہ قطار میں کھڑے لوگ اس کے پیچھے رہ گئے ہیں،وہ مُڑکر

انھیں دیکھتا ہے کہ وہ اب بھی اپنی جگہ پر کھڑے ہیں اوراپنے کھانے کے قلیل حصے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر جم گیا، اپنے خالی پیٹ کا خیال کرتے ہوئے جو کہ بھوک سے گڑگڑارہا ہے، اس نے اپنا سر نیچے کیا اور ایک بھی لفظ کہے بغیر اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے آخر میں دوبارہ کھڑا ہو گیا۔

خواہشات کے پیغامات

کوثر النشابی کی آواز تھی جس کا وہ ہر صبح انتظار کرتا تھا۔جب سے وہ اپنا پرانا ریڈیو لے جاتا تھا جو بیٹریوں پر چلتا تھاتو اس کے ذریعے وہ پروگرام دیکھتا رہتا تھا۔اس انتظار اور امید کے ساتھ کہ اس کے بیٹے (جابر) کی طرف سے ایک پیغام پہنچے گا جس میں اسے بتایا جائے گا کہ وہ ابھی بھی زندہ ہے، وہ اس پروگرام میں سننے والے ہر پیغام کو یاد رکھتا تھا۔ اسے ہردفعہ امید ہوتی کہ جابر کا نام ضرور آئے گا جس کے غمزدہ ماں باپ اس کا انتظار کررہے ہیں، ایک غمزدہ ماں یا باپ کے لیے امید کا پیغام جو انتظار کر رہا ہے۔

لیکن وہ جانتا ہے کہ اسے جابر کا پیغام نہیں ملے گا۔ اسے بہت عرصہ پہلے شہید کیا گیا تھا، لیکن اس نے یہ بات اپنی بیوی (لطفیہ) سے چھپا رکھی ہے تاکہ یہ افسوسناک خبر اس کی جان نہ لے جائے، اور وہ اسے اپنے سے بھی چھپاتا ہے، تاکہ اس کے زندہ رہنے کی واحد وجہ ختم نہ ہوجائے۔

وہ جابر کی طرف سے پیغام آنے کا انتظار کرتا رہتا ہے، اور اناؤنسر کی آواز کو بے چینی سے سنتارہتا ہے جب تک کہ وہ اس پروگرام کا مکمل کلپ نہ سن لے تب تک وہ اپنا ریڈیو بند نہیں کرتا۔

السلام علیکم کی صدااسے آتی ہے تو وہ اپنے اردگرد سرگوشیوں کو نظر انداز کرتا ہے، اپنے دماغ کے بارے میں فکر مند رہتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے فدائین (جابر) کے شہید ہونے کے بعدوہ اسے چھوڑ گیا ہے۔

ایئر لائن

بغیر کسی وارننگ کے اس نے اپنے آپ کو آنکھوں پر پٹی باندھے، پرانے دھاری دار پاجامے میں،ننگے پاؤں، بحیرہ روم سے آگے کے ملک میں جلاوطن پایا، اسے معلوم ہوا کہ ____ بدقسمتی سے____ اسے فلسطینی جلاوطن کہا گیا تھا۔

اس دن سے جب اس نے خود کو فلسطین سے بہت دور پایا، وہ ایک لائف پروجیکٹ پر کام کر رہا ہے،کیونکہ اسے امید ہے کہ اپنے گھر واپس جانا ہے، جہاں اس کی ماں، خاندان، بیوی اور پرائمری اسکول کے طالب علم ہیں۔

اس نے سمندر کے راستے واپس آنے کی کوشش کی، لیکن اس کی حالت کھل گئی، اس کی کشتی ڈوب گئی، اور وہ تقریباً ڈوب کر مر گیا۔ اس نے ایک سے زیادہ منزلوں کے ذریعے زمینی راستے سے واپس آنے کی کوشش کی، حتیٰ کہ اس نے زیر زمین سرنگوں سے بھی کوشش کی جن میں سے ایک اس پر گر گئی، تقریباً اسے اپنے وطن کے باہر زندہ دفن کر دیاگیا۔

اس کے پاس فلسطین واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ایک بار اس نے آسمان میں ایک آزاد پرندے کو دیکھا، اور سوچا کہ کیا اس نے دو پر لگائے ہیں۔ کیا وہ اسے اپنے مقصد تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، ان تمام دکھوں اور خواہشوں کے ساتھ جو اس نے اٹھائے ہیں؟

ٹرینیں

وہ عموماًسفر اور جدائی کے راستے پرایک دوسرے سے ملتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنے حقیقی وطن کے علاوہ ہر وطن سے آتے ہیں، تاکہ وہ اپنی کہانیاں سنائیں۔ اپنی مادر وطن سے قطع تعلق کے ساتھ، جب روانگی کا وقت قریب آیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے پاسپورٹ کا اعلان کیا، جس نے اس کی جلاوطنی کا اظہار کیا۔ وہ قومیت جو انھوں نے آوارہ گردی، بے گھری اور نقصان کے آخری سفر میں حاصل کی تھی۔ وہ ہردفعہ اپنی نئی جدائی کے غم میں نہ رونے کا عزم کرتے تھے، وہ بے نیازی سے مسکراتے تھے اور اپنے وطن فلسطین میں ایک عورت سے ملنے پر راضی ہو جاتے تھے۔ انھوں نے مسکراہٹ اور ہنسی کے ساتھ علیحدگی کا عہد کیااور انھوں نے شرط لگائی کہ ان میں سے کوئی بھی جدائی کے درد اور جلاوطنی کے دکھ سے نہیں روئے گا۔

ان کی مقامی بولیوں میں ڈوبی ان کی فلسطینی ہنسی کی آوازیں اسٹیشن میں بلند ہوئیں، ان کے آنسوؤں کے باوجود جو ان کی آنکھوں میں بمشکل چھپے ہوئے تھے۔

ان میں سے ہر ایک اپنی ٹرین کی طرف بڑھ گیا جو اسے دوبارہ فاصلے کی طرف لے جائے گی۔ہرکوئی جب اپنے جبری مقصد کی طرف آگے بڑھ رہا تھا تو ان میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے نہیں دیکھتا تھا تاکہ ہر ایک کو معلوم نہ ہو کہ وہ رو کر شرط (عزم)ہار گیا ہے۔

دوپہر کا کھانا

وہ ہر دوپہر اپنے بھائی کو اردن کی وادی کی شدید گرمی میں لے جاتی ہے، اور (الکرامہ) کیمپ کے مرکزمیں چلی جاتی ہے تاکہ وہ اور اس کا چھوٹا بھائی یو این آر ڈبلیو اے ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھا سکیں، ریستوران روزانہ کی بنیاد پر دوپہر کا کھانا فراہم کرتا ہے۔ ہر کوئی جس کے پاس ریستوراں استعمال کرنے کا کارڈ تھا کھانا کھاسکتا تھا۔اس کے والد نے اس کے اور اس کے بھائی کے لیے روزانہ کی بنیاد پر دو کارڈ کا انتظام کیا، لیکن وہ اس کی ماں کے لیے تیسرا کارڈ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

وہ اپنے کپڑوں کے نیچے پلاسٹک کا ایک شفاف بیگ چھپا لیتی ہے،وہ اپنا حصہ اپنی ماں کے لیے اس بیگ میں ڈال لیتی ہے۔ اس طرح وہ دوپہر کا کھانابانٹ لیتی ہے اور رات کے کھانے کے بغیر سوتی ہے، جب کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے آدھابچاتی ہے، جو اسے دیا جاتا ہے۔ ہر ایک چھوٹا بچہ اپنے دوپہر کے کھانے کے ساتھ اسے رات کے کھانے کے طور پر کھانے سے روکتا ہے۔

وہ اپنا کھانا اور اپنے بھائی کا کھانا لے کر گئی، وہ دونوں اس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر گرگئے۔سنتری دورسے لپکا، گندگی اور جانوروں کی سی بدبُوسے ڈھکا۔

اس نے ایجنسی ریسٹورنٹ کے انچارج سے کہا کہ وہ اسے دوافرادکے بجائے ایک شخص کا کھانا دے دے، لیکن انچارج

نے صاف صاف انکار کر دیا، اسے سخت ڈانٹ پلائی اوراگلے دن تک انتظار کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ دو نئے کھانے لے سکے۔

کھانا ضائع ہوجانے پر وہ زیادہ پچھتارہی تھی۔وہ اپنے بھائی کو لے کر کاسیفہ الخطرریستوران سے باہرنکل گئی وہ گھر واپسی تک وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی رہی جو گھر کے گیٹ کے سامنے بھوکی اس کا انتظار کر رہی تھی کہ دوپہر کے کھانے میں سے اپنا حصہ وصول کرسکے۔

مشکل پیدائش

اگرچہ اس کے ہاں مشکل پیدائش کا مسئلہ تھا مگر اس کے باوجوداس نے تیرہ بیٹے اور بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ یہ اس کا چودھواں جنم ہے جو سب سے مشکل ہوگاکیونکہ اب وہ عمر میں بھی کافی بڑھ چکی ہے اور برسوں سے پریشانیوں میں دبی ہوئی ہے۔

نرسوں نے اس کے پرانے فلسطینی لباس کو دیکھتے ہی اسے ڈانٹ دیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ ان سے تعلق نہیں رکھتی تھی، زچگی کے دوران ہونے والی درد کی چیخوں کے باعث نرسوں نے اسے خاموش ہونے کو کہا۔ان میں سے ایک نے کہا: "چپ رہو، تم نے اپنی آواز سے سب کو پریشان کر دیا ہے؟"

فلسطینی نے فخر سے جواب دیااور اپنی دردناک روح سے،مشکل سے اپنے الفاظ کو باہر نکالتے ہوئے کہا: "تم کتیاہو، میں ایک فلسطینی گوریلا کو جنم دوں گا۔"

موت

اس کی پھوپھی نے ہمیشہ اپنے کردار سے حیران کیاجس نے فلسطین سے باہر ہر چیز کے بارے میں شکایت کی تھی۔ وہ اپنی جبری ہجرت کے دوران کھانا، پانی، ہوا، لباس، کمپنی اورلوگوں کو وہ پسند نہیں کرتی تھیں، جبکہ یہ سب عناصر اس بناء پرجلاوطنی کے دوران اس پر حاوی تھے، اس نے خود کو نقصان میں پایا۔ تکلیف، تنہائی اور بے چینی کے باعث وہ اپنا مشہور جملہ کہتی رہی: "فلسطین سے زیادہ خوبصورت کچھ نہیں ہے"۔

جب وہ بیمار پڑی تو اس نے اپنے بچوں، پوتے پوتیوں اور رشتہ داروں سے قسم کھائی کہ وہ اسے فلسطین میں مرنے کے لیے لے جائیں گے، یہ کہتے ہوئے: کہ"فلسطین میں موت زیادہ خوبصورت ہے۔"

جب اس نے موت کے گلے میں ہتھیار ڈال دیے تو اس نے ہر ایک کو فلسطین کی سرزمین میں دفن کرنے کا مشورہ دیا، اس اعتماد کے ساتھ کہ اس نے مایوسی کے لمحات میں یقین دیکھاکہ: "فلسطین کی سرزمین اپنے لوگوں کی لاشوں پر زیادہ ترس کھاتی ہے۔"

ہار

اس کے پاس اپنے وطن کا یہ دھات کا ہار ہے جو اس کے گلے میں بھنگ کے دھاگے سے لٹکا ہوا ہے تاکہ یہ ہار اس کے سینے سے غائب نہ ہو جائے۔ وہ آنکھیں جن میں وہ اپنے فلسطین پر فخر کرتی ہے۔

وہ حال ہی میں ایک دور افتادہ امریکی ریاست میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتی تھی جب وہ اپنے کیمپ میں فلسطینیوں کی نسل کشی کے دوران بچ جانے والوں کے ساتھ ہجرت کی۔ اس نے حال ہی میں ایک چھوٹے سے سبز جنگل میں واقع ایک خوبصورت پرائمری اسکول میں شمولیت اختیار کی۔ سکول میں اسے اس چھوٹے سنہرے بالوں والی لڑکی کے پاس بٹھایا گیا... اس کی نظریں اس دھاتی ہار پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے پختہ رنگ کے ساتھ اس کی تعریف کر رہا تھا، اس نے وہ ہار فلسطینی سے اشارہ کے طور پر لیا، اس نے اس حوالہ کا مذاق اڑایا تھا۔ وہ مسکرائی اور اسے پختگی اور عزم کے ساتھ کہا: "میں فلسطین کسی کو نہیں دوں گی۔"

ہوائی اڈہ

وہ ہوائی اڈے کے انتظار گاہ میں ملے، صیہونی، جس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا جواس کے اندرونی رنگ سے میل کھاتا تھا وہ اپنی چوٹیوں کو ہلا رہا تھا جس سے سڑنے کی بو آ رہی تھی،وہ اپنا سرکتاب میں دھنسا کر بیٹھا تھا۔

ساتھ والی نشست پر بیٹھے اس کے پڑوسی کے لیے اس کے لباس، اس کی ٹوپی، اس کے بالوں کی چوٹیوں اور اس کے نعروں سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ وہ صیہونی ہے، جو درخت کے تنے پر لکڑی کے کاک کے چونچنے سے مشابہت رکھتا ہے، اور اس کی خوشبو۔ اس کے پرندے اس بات کا ثبوت ہیں جو یقین کے ساتھ شک کو دور کرتے ہیں کہ وہ صیہونی ہے۔ جبکہ سفر کرنے والے صہیونی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس کا پڑوسی ایک بے گھر فلسطینی ہے۔

صیہونی اپنے پڑوسی کو وقت گزارنے کے لیے کسی بھی گفتگو میں آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے، اس نے انگریزی میں فلسطینی سے پوچھا، جیساکہ اس نے اندازہ لگایاجو کہ اس کی زبان ہو سکتی ہے: "میں اسرائیلی ہوں، اور میں اپنے وطن اسرائیل واپس جا رہا ہوں..... کہاں جا رہے ہو؟"

اس آدمی نے ناگواری سے جواب دیا: "پولینڈ کو۔"

صیہونی نے جعلی دلچسپی سے پوچھا: کیا یہ تمہارا وطن ہے؟!

فلسطینی نے بیزاری سے جواب دیا: ”بلکہ تمہارا وطن جہاں تک میرا وطن ہے، وہ فلسطین ہے۔“

عرب کے نغمات

مونسٹر

صیہونی فوجی کو انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایک وحشی حیوان ہونا چاہیے۔ اس کا دل اتنا مضبوط ہو کہ وہ بے گناہ لوگوں کو مار سکتا ہے، انھیں بے گھر کر سکتا ہواور ان کا فلسطین چوری کر سکتا ہو۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی صہیونی فوجی کو نہیں دیکھا، وہ اپنے وطن سے باہر الکرامہ کیمپ میں پیدا ہوا تھا، لیکن وہ اپنے والدین کے ذریعے سے جانتا ہے کہ صیہونی عفریتوں نے دریا کے مغرب میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔

تعاقب کرنے والے عفریت ان کا تعاقب کرتے ہوئے الکرامہ کیمپ تک پہنچ گئے، گوریلوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ان کے حملہ آوروں نے انھیں تیزی سے شکست دے دی، اور وہ کیمپ کے متجسس بچے، جنھوں نے صیہونی ٹینکوں کو گھیر لیا تھا۔ انھیں ان میں پھنسے راکشسوں کو دیکھنے کی اجازت تھی۔

اس نے سب سے پہلے ٹینک کے منہ سے جھانک کر دیکھا کہ اس میں کون ہے،بچوں نے ایک صیہونی فوجی کو زنجیروں میں جکڑا ہواپایا، وہ ہلنے سے قاصر تھا۔ فاتح ہیروز نے بتایا کہ صیہونی دشمن نے اپنے سپاہیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر وقار کی جنگ میں بھیجا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ وہ اپنی انتہائی بزدلی کی وجہ سے میدان جنگ سے بھاگ نہ جائیں۔

وہ حیران تھا کہ صہیونی سپاہی ایک انسان نہیں تھا جیسا کہ اس نے سوچا تھا کہ فاتح ہیرو نے مسکرا کر کہا: "نہیں، وہ زنجیروں سے بندھا ہوا ایک بزدل کتا ہے۔"

دعم

انھوں نے فلسطینی کاز کی بھرپور حمایت کرنے کا فیصلہ کیا جس سے ان کے "کاز"کو تقویت ملتی ہے، اس کے لیے انھوں نے ایک بین الاقوامی عرب اسلامی تنظیم قائم کی، اس کے لیے بہت سی رقم جمع کی، اور اپنے ممالک کی طرف سے فراہم کی جانے والی رقم کے مطابق اعزازی اور انتظامی عہدے تقسیم کیے گئے۔ اداروں نے آزادی اور عرب وقار کے لیے تڑپ رکھنے والے عوام سے وعدہ کیا کہ وہ معاون، موثر اور فوری کارروائی کریں گے، اور انھوں نے امید ظاہر کی کہ مقبوضہ علاقوں اور تارکین وطن فلسطینی عوام کو ان کے مصائب کا بنیادی حل فراہم کریں گے۔ ایک جرات مندانہ، منتظر اور فیصلے کی امید کے ساتھ، انہوں نے دور دراز جزیرے پر ایک سیاحتی گاؤں کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اپنے وعدوں کو حاصل کرنے کے لیے پر سکون طریقے سے سوچ سکیں کہ انہوں نے اپنی تنظیم کے لیے عرب عطیات سے ایک بڑا بجٹ مختص کیا۔ وہ عورتوں، شرابوں اور لذتوں سے دل بہلاتے رہے تاکہ اپنے تاریک نفسوں میں فلسطینیوں کی حمایت کے لیے ایک روشن خیال پیدا کرسکیں، ان کی ملاقات میں کافی وقت لگا، اور فلسطینیوں نے طویل عرصے تک اس حل کا انتظار کیا جو سامنے نہیں آیا۔

خون

وہ ایک قطعہ زمین پر فلسطینی اور غیر فلسطینی کے نام سے لڑ رہے ہیں۔ اس جنگ سے تنگ آکروہ خود کو تہہ خانے میں بند کر کے وہاں سے الگ کر لیتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ سازش کیا ہے۔یہ فلسطینیوں کا قتل عام، ان کو ختم کرنے اورصیہونی وجود کے لیے ایک بڑی ریاست کے قیام کی سازش کا حصہ ہے۔

وہ اس فریب میں شامل نہیں ہونا چاہتا، اس لیے وہ اس سازش میں شامل ہوئے بغیر آنکھیں بند کر لیتا ہے، جسے سمجھ نہیں آتا کہ وہ کیوں لڑ رہا ہے۔ وہ اپنے فلسطینی دوست کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ وہ اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتے ہیں، مزے اور معصومیت کی تصویریں دیکھتے ہیں، اور ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں۔

نیا نصاب

اس کے والد اسے سخت ڈانٹتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کو ڈانٹتے ہیں کہ اگر وہ ان مضامین میں مکمل فائنل گریڈ حاصل نہیں کرتی کیونکہ وہ UNRWA اسکول میں پڑھتی ہیں جہاں وہ مفت پڑھتے ہیں۔ اس نے ان سے بے تکلفی سے کہا: "فلسطینیوں کے پاس علم کے علاوہ کوئی دولت نہیں ہے، تم سب کو اپنی سائنسی تعلیم جاری رکھنی چاہیے، چاہے میں اس کے لیے اپنے کپڑے بیچ دوں۔"

عرب ملک کی طرف سے ایک نیا نصاب جاری کیا گیا تھا جس میں وہ پڑھ رہے تھے کیونکہ کلاس میں موجود سبھی کو نئی، غیر استعمال شدہ کتابیں ملیں گی، ان کے برعکس وہ استعمال شدہ، بوسیدہ کتابیں حاصل کرنے کے عادی تھے۔

اس نے تاریخ اور جغرافیہ کی دو نئی کتابیں حاصل کیں، جن کی خوشبو ایسے نئے کاغذ کی طرح تھی جس کے ساتھ انسانی ہاتھوں نے کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی، اس نے جغرافیہ کی کتاب میں فلسطین کا نقشہ تلاش کیا، اور اس کے بیچ میں اسرائیل کا نام چھپایا۔ تاریخ کے موضوع پر، اس نے اسرائیل کا نام پڑوسی ممالک میں سے ایک پایا۔

اس نے دونوں کتابوں کو پھٹ جانے کی فکر کیے بغیر بند کر دیا۔اب اسے جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین میں زیرو لینے کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ غدار مضامین تھے۔

صیہونی

چونکہ وہ جوان تھی، اس کے گھر والوں نے اسے بتایا کہ صیہونی یہودی ہی تھے جنھوں نے اس کے وطن فلسطین کی عصمت دری کی اور انھیں اوروہاں کے لوگوں کو اپنے وطن سے نکال دیا۔ وہ محبت کے لیے فلسطین کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ایک دھاتی نقشہ کے ساتھ پلی بڑھی جو اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔

اس عرب فوجی نے فلسطین پر صیہونی قبضے کے خلاف احتجاجی مارچ کے دوران اس کا فلسطینی ہار کاٹ کر اسے زمین پر پھینک دیا، اس پر اپنے موٹے فوجی جوتے مارے اور اس سے کہا: "صیہونی بہتر ہیں۔ آپ کو ہمارے پاس کون لایا ہے؟"

اس مایوس کن صورتحال سے متاثر ہوکر وہ بچپن میں طویل عرصے تک روتی رہی۔ لیکن جب وہ بڑی ہوئی تو اس نے دریافت کیا کہ جب اس کے اور اس کے خاندان کی اس کے وطن سے دوسرے ملک میں نقل مکانی ہوئی اور وقتاً فوقتاً ان کے اندھا دھند ظلم و ستم کے مقابلے میں یہ صورت حال سب سے کم تکلیف دہ تھی، جیسا کہ اس کی دادی کہتی ہیں، وہ "کیرئیر" ہیں ____ دکھ اور زیادتی کا۔"

آج، اس عرب ملک میں جس میں وہ رہتے ہیں، سیکورٹی افراتفری اور اقتدار کے بدلتے مراکز کے درمیان، گھر کے مالک اور اس کے اہل خانہ نے اسے اپنے غلام گھر سے نکال

دیا، جسے وہ دو دہائیوں سے کرائے پر لے رہے ہیں۔ گھر کے مالک کو زیادہ پیسے کا لالچ تھا جس کی بناء پر اس نے انھیں سڑک پر پھینک دیا، اور جس نے ان سے زیادہ رقم ادا کی اس کو مکان کرایہ پر دے دیا۔ اس بغاوت نے ان کا فرنیچر، کپڑے اور ان کی ملکیت کی ہر چیز کو ان کے گھر سے نکالنے کے بعد، ننگے پاؤں اور خالی ہاتھ کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبورکردیا

یہاں ان کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

ایک بار پھر، انہوں نے خود کو ایک فلسطینی خاندان کے طور پر کسمپرسی کی حالت میں پایا۔ وہ اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوئی، جو اس وقت تک غم زدہ تھی جب تک کہ اس کا صبر ختم نہ ہو گیا، اورماں نے ملامت کرتے ہوئے کہا: "تم نے مجھے بتایا کہ صیہونی صرف فلسطین میں موجود ہیں''!

" وہ بھی یہاں ہیں،" ماں نے اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ اس کی"لاش" کو گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

عزت

"عرب عزت دار ہے اوروہ کبھی بھی بے عزتی کوقبول نہیں کرتا ہے،" وہ اپنی ناخواندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ یہ جملہ طلباء کے کانوں سے ایک سے زیادہ بارٹکرایا اور پوچھا: "تم اسے دوبارہ کیوں پڑھ رہے ہو؟"

کلاس میں قہقہہ گونجا، پھر قہقہہ گونج اٹھا، جیسے پانی کی بوتل زمین پر گر رہی ہو، نوجوان استاد نے ڈرتے ڈرتے اور واضح شرمندگی کے ساتھ پوچھا: "کیا میں نے کوئی ایسی بات کہی جس سے ہنسی آئے؟"!

کلاس میں خواتین کی رہنما ام محمود نے جواب دیا: "یہ بہت پہلے تھا، اوراے خدا ہمارے حال کو دیکھو کہ اب کیا ہو رہا ہے؟"

ایک اور خاتون نے طنزیہ انداز میں مزید کہا: "صرف ایماندار عرب ہی بورڈ میں شامل ہیں۔"

عربیت

امیر عرب نے اپنے شرمساری سے نجات پانے کے لیے اپنا لکٹتا ہواپیٹ بڑھایا، جسے اس نے نوکرانیوں اور محسنوں کے ساتھ عیش وعشرت میں بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھایا ہوا تھا جو اسے زبردستی روک نہیں سکتے تھے اور نہ ہی اس کے نقصان کا ازالہ کر سکتے تھے۔

وہ اخبارات میں مسکراتے ہوئے نظر آنا پسند کرتا ہے، اور وہ دوستی اور تحائف کے ذریعے اپنا پیسہ مصیبت زدہ اجنبیوں، خطرے سے دوچار جانوروں، دنیا کی انجان سرزمینوں کی قدیم عمارتوں اور خوبصورت عورتوں پر لگاتا ہے جنہیں وہ اپنے حرم کی طرف راغب کرتا ہے۔

اسے عرب انسان دوست کا لقب بہت پسند ہے، اور وہ اپنے آپ کو دمشق، ریشم، پیلے، چاندی، سونا، اور پرتعیش کپڑوں، نایاب جوتوں، اور قیمتی چمڑے اور کھالوں کی بناوٹ سے بہت زیادہ آراستہ کرتا ہے۔

اس نے قریب اور دور کے لوگوں کو پیسے عطیہ کیے اور اپنی تصویریں بین الاقوامی اخبارات میں اپنے فلاحی کاموں کے جائزوں میں شائع کروائیں اور وہ اپنی زبان سے واقفیت اوران کی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کی خبروں کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکا۔

انھوں نے ایک پریس انٹرویو میں دعویٰ کیا کہ فلسطینی عوام کے مصائب نے اس کے دل کو جلا دیا ہے، وہ چربی سے

ڈھکے ہوئے ہیں، اور وہ میڈیا کے لیے اپنے بے تحاشہ آنسوؤں کو اجاگر کرنے کا خواہاں تھا، جو اس نے فلسطینی عوام کے دل کھول کرعطیات دیے تھے۔ ان کے لیے دعا کرنے کے لیے عمرہ کیا، اور کعبہ میں اس نے فوری طور پر خدا سے ان کی مدد کرنے کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی ایسا شخص پیداکرے جو ان کی مدد کرے، اس نے ان کے لیے دعا کرنے کے لیے کافی دیر تک اپنے ہونٹوں کو پھیلایا، یہاں تک کہ کیمرے کے لینز نے اس کی مناسب تصویر کھینچ لی۔ جس نے فلسطینی کاز کے لیے ان کی بھرپور حمایت ریکارڈ کی!

ایک سپاہی

اس کی ماں نے اسے بوسہ دیا، اور اس سے کہا کہ اس کے گھر والوں اور رشتہ داروں نے گواہی دی کہ ماں نے اسے کہا: "فلسطین کو آزاد کرنے سے پہلے میں تم سے راضی نہیں ہوں گی۔"

اس نے دو سال پہلے اس فوج میں شمولیت اختیار کی تھی لیکن یہ آزادی اس کا مقدس مشن ہے کیونکہ وہ ایک بڑی عرب فوج کا حصہ ہے جو صہیونی غنڈوں سے فلسطین کی آزادی میں حصہ لینے آئی تھی جس نے اس کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔

جنگ کا آغاز صیہونیوں کے ایک گروہ سے ہوا، جو اس دن کے غروب ہونے پر ان سب کو ختم کر سکتے ہیں، تاہم، ان کی قیادت کی طرف سے عرب کے دارالحکومت میں ان کے پیچھے ہٹنے کا حکم آیا ہے۔ جو فوج اپنی فتح کے عروج پر پہنچ چکی تھی وہ مکمل طور پر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹنے سے انکاری ہوجاتا ہے، وہ جھکی ہوئی پیشانیوں، ٹوٹی ہوئی آنکھوں اور ناکام رائفلوں کے ساتھ فوج کے راستے سے نکلتا ہے اور اکیلے صیہونی گروہوں سے لڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

مظاہرہ

فلسطینی کیمپ (صابرہ شتیلہ) کو عرب مجرموں اورصیہونیوں کے ہاتھوں بربریت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، کیمپ کے مکینوں نے اپنے گوریلا بیٹوں سے مدد کی اپیل کی، لیکن اپنے بعد باقی رہ جانے والوں کے سوا کسی کو کوئی جواب نہیں ملا۔ ہر کوئی اپنے دفاع کے لیے اپنی سستی جانیں قربان کر چکا تھا، جب کہ سمندر نے باقی فلسطینی گوریلوں کو ان کے خاندانوں، ان کی یادوں، ان کے خوابوں اور ان کے ساتھیوں کی قبروں سے دور کر دیا تھا۔

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، وہ سب اپنا ایک فیصلہ کن تاریخی کردار ادا کر رہے تھے، کیونکہ وہ پورے خلوص اور دلچسپی کے ساتھ عالمی فٹ بال کوالیفائرز کی پیروی کر رہے تھے، گول گن رہے تھے، اور اپنی خواہش کے مطابق ہارنے والے یا فاتح کا ساتھ دے رہے تھے۔

صبح صابرہ اور شتیلہ کیمپ فلسطینیوں کے خون سے دریا کا روپ دھار چکا تھا اور عرب دنیا کے ہر انچ میں بہادر عربوں نے ہارنے والی عرب فٹ بال ٹیم کی حمایت میں لاکھوں مظاہروں میں سے ہر ایک میں دلیرانہ، غصے کا مظاہرہ کیا۔ اور ایک وہ جو جیت گیا تھا، انھوں نے اپنے شاندار تاریخی مظاہروں کے ایک مظاہرے میں بھی دکھی کیمپ میں مارے جانے والوں کو یاد نہیں کیا! کیمپ اپنی اداسی میں سو گیا، اور نہ جاگا!

دیر

وہ بانجھ ہے، اس کا رحم بانجھ ہے اور عورتوں میں سب سے زیادہ امیر بننے کے جنون میں مبتلا ہے۔وہ ایک خیال رکھنے والی، دیکھ بھال کرنے والی ماں نہیں، وہ چاہتی ہے کہ ایک بچہ دکھاوے کے لیے لے آئے، اس لیے وہ اپنے تمام ماضی کوبھلا کر اسے اپنے اور اپنے سے منسوب کر دیتی ہے۔اس کا شوہر وہ اس کے مال کا وارث ہو، اس لیے ساری رقم شوہر کے مرنے کے بعد اس کے رشتہ داروں کے پاس جانے کی بجائے اس کے پاس جائے گی۔

آخر کار اسے لبنان کے فلسطینی کیمپوں کے یتیموں میں وہ چیز مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔وہ یتیم جن کے گھر والوں نے اپنی جانیں گنوا دی تھیں اور انہیں بغیر کسی رحم یا رحم کے یتیم چھوڑ دیا تھا، بغیر کسی شرط کے اس نے ان سے ایک اچھاسا بچہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق سنہرے بالوں، سنہری جلد اور سبز آنکھوں کے ساتھ اسے اپنی دو بہنوں کے درمیان سے چھین لیا، کیونکہ اسے ایک مرد بچے کی ضرورت تھی جو اس کے شوہر کی دولت کا وارث ہو۔ وہ اجرت، خیرات یا زچگی کی تلاش میں نہیں تھی۔

وہ اسے اپنے گھر لے گئی، اس کی دو بہنوں کی چیخ وپکاراورمنت سماجت کے باوجود ان سے معصوم بھائی چھین لیا گیا تھا، اس نے اعلان کیا کہ وہ اس کا بیٹا ہے، اس کا نام

بدل دیا اور اسے کیمپ، اس کے خاندان اور اس کی دو بہنوں کو یاد کرنے سے روک دیا۔تھوڑی دیر بعد، وہ بھول گیا کہ وہ فلسطینی ہے، اور اس ہجوم میں گم ہو گیا جس کی بدولت اس "مہربان" عرب عورت نے اسے گود لیا اور اسے اس کی اصلیت سے الگ کر دیا۔

عدو کے نغمات

چور کی بیوی

جب سے اس نے مشاہدہ کرنا شروع کیا کہ فلسطینی عورت جو اپنی زمین پر ٹین کی جھونپڑی میں رہتی ہے اور وہ دنیا کو ایک اور زاویے سے دیکھ رہی ہے، صہیونی ادارے کی انتظامیہ نے اس کے شوہر کو اس زمین سے محروم کر دیا ہے اور اس کے خاندان سے زمین کو ضبط کر لیا ہے جبکہ وہ فلسطینی عورت اپنی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ایک ٹین کی جھونپڑی میں رہنے کا عزم رکھتی تھی۔

اس فلسطینی عورت کے ساتھ رہنے سے پہلے، اسے یقین تھا کہ وہ وعدہ کی سرزمین میں ایک مثالی شوہر کے ساتھ رہنے والی ایک خوش وخرم بیوی ہے، لیکن جب اس نے اس فلسطینی عورت کی زندگی کا مشاہدہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ صرف چور ہیں جنھوں نے چوری کی۔ اپنے لوگوں سے زمین، اور یہ کہ وہ ایک بے رحم سپاہی کے ساتھ رہنے والی دھوکہ بازعورت سے زیادہ کچھ نہیں تھی جس نے فلسطینی قیدیوں کی عصمت دری کی تھی، وہ رات کو طوائفوں کے ساتھ مذاق کرتا ہے، اور اسے ایک نوکرانی کے طور پراپنے گھر چھوڑ دیتا ہے۔

وہ اس فلسطینی کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ اس کا قانونی حق ہے وہ اس کے فلسطینی مالک کو واپس کر دے، وہ اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جائے اور وہ اپنے اصل وطن میں رہنے کے لیے فرانس واپس آ

جائے۔ وہ اس سے انکار کرتا ہے، اور اسے شدید مارنے کے بعد غصے کے طوفان کی شکل میں اس کا سامنا کرتا ہے۔

وہ اس کی مرضی کے خلاف اپنی خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے، وہ اس کے لیے وہ کھمبیاں تیار کرتی ہے جو اسے پسند ہیں، انہیں زہریلی قسم سے احتیاط سے چنتی ہے پھر اس کے لیے پکاتی ہے، اور شام کے وقت اسے اپنے لیے معافی کے طور پر کھانے کے لیے پیش کرتی ہے۔ اس نے صبح اس کے ساتھ کیا کیاوہ بھول جاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ کھاتی اوررہتی ہے تاکہ وہ مل کر اس موت کا سامنا کریں جس کا ہر چور مستحق ہے۔

خاموشی

یہ فلسطینی گوریلوں کے سامنے ان کے لیے ایک خوفناک شکست تھی۔ ان کا گولہ بارودا ور صرف کچھ زخمی فوجی ہی اس جال سے بچ گئے۔

اس نے ایک مہینہ نفسیاتی علاج میں گزارا تاکہ صہیونی فوج کی انتظامیہ اس کے اہل خانہ کو اس سے ملنے کی اجازت دے جب کہ انہوں نے اسے ایک بڑی فتح کے بارے میں بہت سے جھوٹ سکھائے جو صرف جھوٹ بولنے والوں کے تصور میں تھے۔ فوجیوں نے اسے اپنی بکواس دہرانے پر مجبور کیاکہ صیہونی غاصب کووہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بنیادی طور پر شکست کھا گئے تھے۔

اس نے ان میں سے کوئی بھی جھوٹ نہ دہرانے کا فیصلہ کیا، خود کو بولنے سے منع کیا، گونگا ہونے کا بہانہ کیا اور ہمیشہ کے لیے خاموش رہا۔

عربی گانا

مکمل رازداری کے ساتھ، وہ مصری بولی کے ساتھ عربی گانے سن کر اپنے جذبات اور خوابوں کی تسکین کرتی ہے، کیونکہ اس کے لیے کسی بھی عربی کے لیے ہمدردی اور محبت کا اظہار حرام ہے، چاہے وہ گانا ہی کیوں نہ ہو۔

وہ "وعدہ شدہ سرزمین"نامی ایک چال لے کر یہاں آئی تھی، اور جب وہ اس کے جال میں پھنس گئی تو اسے معلوم ہوا کہ صہیونی کالی بیوہ اسے کھا جائے گی کیونکہ وہ مشرقی یہودی ہے، جیسا کہ وہ اسے کہتے ہیں۔

اس کی طرح بہت سے مشرقی یہودی ہیں جو دھوکے سے اس سرزمین پر آئے ہیں وہ ایک مشرقی یہودی نہیں ہے، وہ دھوکے سے بننے والی یہودی ہے جس نے اپنے لوگوں کو اسی طرح مصر میں چھوڑ دیا جس طرح دوسروں نے مراکش، یمن اور عراق میں اپنے لوگوں کو چھوڑا، اور وہ ان سب کو اس جگہ جلانے کے لیے آئے تھے۔

وہ کہاں سے آئی تھی، انہوں نے اسے یہودی قرار نہیں دیا، لیکن یہاں اس صہیونی بستی میں اس کی مذمت کی جاتی ہے، بغیر کسی وجہ کے، کیونکہ وہ مصر سے آنے والی مشرقی ہے، اور اسے سب سے کم حق ملتا ہے، جب کہ مغربی یہودی کو۔ تمام مراعات حاصل ہیں۔

وہ اپنی دھوکہ دہی پر غصے کا اظہار نہیں کر سکتی اور نہ ہی اپنے شدید پچھتاوے کی وجہ سے اس نے اسکندریہ کے

ساحل کو چھوڑ دیا، جہاں تفریح، محبت، پڑوسی اور اچھی صحبت تھی، اور یہاں تک کہ وہ ایک الگ تھلگ اصطبل میں پہاڑوں کی چوٹی پردھات کے ایک ڈبے میں مرنے تک محفوظ رہی۔

وہ ہر روز ان لعنتی تباہ کن لوگوں سے بدلہ لیتی ہے جو چھپ چھپ کر اس سے مصری عربی گانے سن کر، انہیں گاتے، ان کے عربی الفاظ کو پیار، خوشی اور لگاؤ کے ساتھ سنا کر اور اسکندریہ کے ساحل کی ریت میں اپنے پاؤں ڈوبنے کے خواب دیکھ کر۔

کوڑا

گہرائی میں، اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اخلاق، اقدار اور شرافت سے کتنا عاری ہے، اور نشے کی حالت میں وہ اپنے آپ کو بڑے شوق سے "ذلت زدہ" کہتا ہے۔ جب وہ بیدار ہوتا ہے، تو وہ بغیر رکے اس عرفی نام سے اپنے آپ سے سرگوشی کرتا ہے۔

وہ زناکی پیداوار ہے، ہر اس شخص کی گواہی کے مطابق جو اسے جانتا ہے۔ وہ خاص طور پر اور قطعی طور پراپنے کسی باپ یا ماں کو نہیں جانتا، لیکن یروشلم میں صیہونی مذہبی اسکول ہے جس نے اس کی دیکھ بھال کی ہے۔ اس کے والدین نے اسے گھرسے نکال دیااور اس کی پرورش اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق تیارنہ ہوا۔وہ، اخلاق، اقدار اور انسانیت سے عاری، ہر جرم کو سرد مہری اور مردہ ضمیر کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔

کام کے اوقات کے دوران، وہ نہشون فورسز کے رکن کے طور پر اپنے مکروہ پیشہ پر عمل کرتا ہے، جو حراستی مراکز، تفتیشی مراکز، اور پھانسی کے چیمبروں میں فلسطینی قیدیوں کو اذیت دینے میں مہارت رکھتی ہے۔

وہ فلسطینی قیدی کو اس وقت تک کوڑے سے پیٹنا پسند کرتا ہے جب تک کہ اس کی پیٹھ، چہرے، کندھوں، پیٹ اور رانوں سے خون بہنے نہ لگے، پھر اس پر جھپٹتا ہے۔ اس کے ہاتھ

پاؤں باندھتے اور کھولتے ہوئے اس پر غضب ناک ہوتا ہے اور لومڑی کی طرح اسے نوچ کھانا چاہتا ہے۔

اپنی سرکاری چھٹیوں کے اوقات میں، وہ اپنے ان "شیکل" کے بارے میں فخر کرتا ہے، یعنی رات کی جسمانی اور قدرتی طور پر سخت ترین لڑکیاں ہیں، اور وہ اس کی ٹانگیں اور ہاتھ باندھنے کو کہتا ہے، اور اسے اسی کوڑے سے مارنے کو کہتا ہے جو وہ اسے مارنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جب تک کہ وہ اس کی آواز کو خاموش نہیں کر دیتی، چیخ چیخ کر اور بغیر کسی جواب کے مدد کے لیے پکارتی ہیں۔

وہ اس وقت تک نہیں سوتا جب تک کہ طوائفوں میں سے کوئی اس کے منہ پر تھوک نہ دے اور اسے "کمینہ" کہے پھر وہ آرام کرتا ہے اور سوتا ہے جس طرح وہ حقارت اور اذیت پاتا ہے۔

لباس

صیہونی موساد نے اسے ایک ریٹائرڈ ماڈل اور لندن کے سب سے بڑے فیشن ہاؤس کے مالک کی حیثیت سے فلسطینی لباس پہننے والی صہیونی خاتون کی تصویر کی تشہیر کرنے کے لیے بہت زیادہ رقم ادا کی۔، اور دنیا کے سامنے تصور اور یاد میں پودے لگانا کہ یہ صیہونیوں کے ورثے کا حصہ ہے۔

اسے اس آسان کام کے عوض بہت سا پیسہ کمانا پسند تھا، جس کی وہ عبادت کرتی تھی، خواہ اسے فلسطینی لباس سے جسم کو ڈھانپناہی پڑجائے اوروہ اس پر حرص کے دروازے بند کر دیتا ہے،اسے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ جو جسم کی سستی شے ہونے کا عادی ہے،وہ پوری دنیا میں جسم فروشی کا بازار گرم کرنے اور عورت کے جسم کو ہر خریدار کے سامنے بے نقاب کرنے کا عادی ہے۔

لیکن وہ اس معاہدے کو جاری رکھنے سے قاصر تھی۔ یہ فلسطینی لباس جب بھی اسے پہنتے ہیں تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فلسطینی ہے اور صیہونی دشمن کے جسم میں غصے کی لہردوڑ جاتی ہے اور وہ "آزاد فلسطین" کا نعرہ لگانے کے بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ حالت اس پر حاوی ہو جاتی ہے، اور وہ سڑک پر پتھر اٹھا کر ہر اس صیہونی پر پھینک دیتی ہے جسے وہ لندن میں جانتا ہے، یا اتفاقاً یا پیشگی انتظامات سے ملتا ہے۔

اس حالت نے ہر اس ماڈل کو متاثر کیا جو اس کے گھر میں کام کرتی تھی جب اس نے فلسطینی لباس پہناہوتا تھاوہ اپنے سامنے فلسطینی لباس دیکھنے کی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے موساد میں اپنے اعلیٰ افسر کو اپنے مشن کے لیے معافی کا خط بھیجا، جس میں اس نے اس لباس کی لعنت کی وضاحت کی، اور یہ کہہ کر نتیجہ اخذ کیا: "یہ ان کا ہے، اسے چوری کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ یہ ہم پر لعنت ہے۔"

چور

وہاں سپین میں انھوں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ قید کیا۔ کیونکہ وہ ایک چور ہے جسے خواتین کے پرس اور بیگ چوری کرنا پسند ہے۔ جب وہ دھوکہ دہی کی سرزمین پر ہجرت کر گیا، تو وہ ایک ایسا چور بن گیا جو ایک صہیونی سپاہی کا درجہ رکھتا تھا جس نے ایک پورے ملک کو اس کے لوگوں سے چوری کر لیا تھا، اس نے اپنے کسی بھی جرم کے احساس کے بغیر اپنے پاس موجود ہر مالی امانت کو غبن کیا۔ اسے جلد ہی بے نقاب کیا گیا، اس لیے اسے ایک فوجی عدالت میں بھیج دیا گیا جس نے اسے پانچ سال قید با مشقت کی سزا سنائی،اس کی رائے کے مطابق اس کے خلاف اس غیر منصفانہ فیصلے پراسے واپس کر دیا گیا۔اس نے جج سے لاپروائی اور ایک معنی خیز آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہا: "آپ کو آپ کی چوری کی رقم مل جائے گی اگر آپ فلسطین کو واپس کر دیں گے، جو آپ نے چوری کی ہے، میں اس کی تھوڑی سی رقم واپس کر دوں گا جبکہ جس کے بدلے میں آپ کو بڑی رقم واپس کر دوں گا۔ جو تم نے چوری کی ہے۔"

فوری اپیل پر بحث کے بعد، جج نے خوفناک معنی کے ساتھ مسکراہٹ کے ساتھ فیصلہ دیا اورسپاہی چور کو بری کر دیا گیا!

رحم

صیہونی نشریاتی ادارے نے کئی بین الاقوامی سیٹلائٹ چینلز کے درمیان مشترکہ طور پر نشر ہونے والے ایک پروگرام میں ایک فلسطینی گوریلا کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مکان کو مسمار کرنے کی ویڈیو رپورٹ دکھائی تھی کیونکہ وہ اپنے وطن کا دفاع کر رہا تھا۔

فلم میں صیہونی فوجیوں نے ایک فلسطینی گھر کو ایک چٹان کی چوٹی پر گھیر لیا تھا، انہوں نے وہاں کے لوگوں کو وہاں سے بھاگنے کا موقع نہیں دیا، اگر بلڈوزر کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچتی تو وہ ننگے پاؤں باہر نہ نکلتے۔ وہ خوفزدہ ہو کرچارمنزلہ عمارت سے باہر نکلے وہ ایک بڑا خاندان تھا، چھوٹا لڑکا ماں یا باپ کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور وہ سب اپنے گھر کے ملبے تلے دبنے سے بچنے کے لیے دوڑ بھاگ کررہے ہیں، باہر نکلتے وقت کچھ خواتین نے صہیونی فوجیوں کی وردیوں کے گریبانوں سے چمٹ کر انھیں ان کے گھروں سے دور دھکیل دیا۔ اسے بچانے کی کوشش کی گئی لیکن ان کی کوشش بے سود رہی کیونکہ بلڈوزر بھیڑیے کی رفتار سے گرجتے ہوئے ان کے فولادی گھر کے اندرجاگھسے۔

اچانک، کیمرہ جائے وقوعہ پر موجود ایک صیہونی فوجی کے قریب پہنچتا ہے، جو ایک گھر کی دہلیز پر جھکتا ہے تاکہ اپنے سامنے ایک سرخ بالوں والی بلی کو اٹھا سکے۔ (کیمرہ)

اس منظر کے قریب پہنچ گیا یہاں تک کہ اس کی عینک کا شیشہ سپاہی کے بالوں والے ہاتھوں سے تقریباً چپک گیا جب کہ وہ بلی کو دہلیز سے اٹھا رہے تھے۔ نشریاتی ادارے نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے جانوروں کے لیے صیہونی فوجی کی شفقت کو سراہا اور دنیا سے کہا کہ وہ صیہونی فوجی کے اخلاق کے احترام میں کھڑے ہوں جو ایک پالتو جانور کو فلسطینیوں کے مکان کی مسماری کی جگہ سے دور رکھناچاہتا ہے۔

اس جعلی ہمدردی پر سٹوڈیو کے عملے کی تالیوں کی آواز گونج اٹھی اور اس صیہونی فوجی کے رحم کے لیے سیٹیاں بجائیں اور اس کی وجہ سے زندہ بچ جانے والی پالتو بلی کے لیے خوشی کا نعرہ لگایا۔ ایک فلسطینی گھر کو بلڈوزر سے دھکیلتے ہوئے، پہاڑی کھائی میں گرنے کی ویڈیو میں، اور اس کے گھر والوں نے اس کا ماتم کیا، اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے ان کی بے گھری سے زیادہ سیاہ بلی سے زیادہ ہمدردی اہمیت کی حامل تھی۔

چال بازی

صیہونی آباد کار غصے میں اس طرح اٹھ کھڑا ہوا اور بستی کے اہلکار کو اپنے ڈھیلے لفظوں اور اپنی گھٹیا، غصے والی روح سے چُننے کے لیے تیار ہو گیا۔ آبادکاروں کا ایک ہجوم اس کے ارد گرد جمع ہو گیا۔

آباد کار نے مرغ سے پوچھا: "وہ شہد اور دودھ کہاں ہے جس کے لیے ہم یہاں ہجرت کر کے آئے ہیں؟" ہمیں اپنے ارد گرد موت، تباہی اور خوف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا؟

سیٹلر مینیجر نے اپنی چھوٹی ٹوپی کو ایڈجسٹ کیا جو اس کے سر پر پرندوں کی بوندوں کی طرح گر رہی تھی، اور اپنی شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لاتعلق جواب دیا: "شہد اور دودھ یہاں نہیں ہیں، لیکن وہ جنت میں ہیں۔''

آدمی

صیہونی فوج روزمرہ کے فوجی کام نے اسے ایک فوجی طوائف بننا سکھایا تھا، اس کے پاس ہر اس فوجی اہلکار کے ساتھ غلط تعلقات قائم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ اس کے لمبے ڈھیلے بالوں کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو ہر اس شخص کے ہاتھوں فروخت کیا جو اس کی قیمت ادا کرے گا، مراعات، تحائف، پارٹیوں، دوروں اورملازمت میں پروموشنز کی بنیاد پر... اس کا جسم بہترین جنس ہے جس کی وہ تجارت کر سکتی ہے۔

اس کے جنسی جنون، اس کی سستی روح، اور اس کی بیماری (ایتھر) کے انفیکشن نے صیہونی جیل کے کمانڈر کو اس کے جسم سے بیگانہ کر دیا، اسے واپس آنے کے بغیر چھوڑ دیا، اور اسے فلسطینی قیدیوں کو جنسی تشدد کے سخت ترین طریقوں سے اذیتیں پہنچانے پر مامور کیا۔ اور جب وہ ان کو اذیتیں دے کر تھک جاتی ہے، تو وہ ان کو اپنی بیماری منتقل کرنے کے لیے اپنے متاثرہ خون کے انجیکشن لگاتی ہے کیونکہ وہ اس بیماری کی شرمندگی اپنے خاندان اور ملک کے سامنے جھیلتے ہیں۔

لیکن اس مذہبی فلسطینی قیدی نے اس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور وہ اسے بدصورت کسبی کہتا رہا اور اس کے سامنے اس کے سستے اور برباد جسم کو ٹھکرا کر اس کے جنسی تشدد پر ایک لمحے کے لیے بھی چیخ وپکار نہیں کی۔ اس کے

بارے میں تاکہ کوئی جان اس کے عذاب کو تسلیم نہ کرے، اور نہ ہی اس کے جسم پر اس کے ظلم کی فتح کا احساس کرے، وہ اس کے سامنے دیوار کی طرح کھڑا رہا، اس نے بجلی کے جھٹکے سے اس کے عضو تناسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، لیکن اس نے اسے سنا نہیں۔ اس کی التجائیں نکالنے کے لیے اس نے بجلی کے جھٹکے بڑھا دیے،بالآخر اس نے اس کی جان لے لی۔

قیدی نے اس کے ظلم اور انتقام سے ہمیشہ کے لیے بچنا چاہا، جس کو وہ حقیر سمجھتا تھا،وہ اس کی خوشبو کی بدبو سے بھاگا جب اس نے اس کے ساتھی صیہونی کو پسپا کیا۔ تشدد کیا، اس سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس نے مایوسی سے اسے جواب دیا: "وہ واحد آدمی ہے جس نے میرے جسم کو مسترد کیا تھا، اس لیے میں نے اسے مار ڈالا۔"

آر پی جی

ایک بار پھر، وہ اپنے سامنے چھوٹے چھوٹے فلسطینی بچوں کو آر پی جی توپیں لے کر دیکھتا ہے، جب بھی وہ ان میں سے کسی کو گولیوں سے مارتا ہے یا اسے درجنوں گولیوں سے چھیدتا ہے تو وہ ایک ہی بچے کو دیکھتا ہے۔ اس پر دوبارہ حملہ کرنے کا سامناکرتا ہے۔

وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ یہاں لبنان کے اس فلسطینی کیمپ میں انہیں بتایا گیا تھا کہ یہ ایک فوری آپریشن ہو گا، جس میں وہ صرف ایک گھنٹے میں فلسطینیوں کو نیست و نابود کر دیں گے اور پھر لبنان کے پہاڑوں سے چرائے گئے لال پتوں کے تاج پہن کر واپس آئیں گے۔ لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ وہ لڑکوں کے سامنے سے بھاگتے تھے، شکست خوردہ اور خوفزدہ ہوتے تھے، ان کے پیچھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

وہ وہی چہرہ دیکھتا ہے جو اسے گھور رہا ہوتا ہے، وہ بچہ اس کے سامنے سے نہیں بھاگتا، بلکہ اس کے ساتھی صیہونی فوجی کو مار ڈالتا ہے۔ ARPG آرٹلری نے اسے ٹینک کے گڑھے سے ایک میزائل سے نشانہ بنایا جس میں وہ پناہ لے رہا تھااور لڑکا گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھر گیا۔

وہ ہر جگہ، اس کے خواب میں، اس پر حملہ کرتا ہے اور وہ اپنے بستر پرپسینے پسینے ہوجاتا ہے اور اس سے کہتا ہے: "تمھیں دوبارہ ماہر نفسیات سے ملنا چاہئے۔"

وہ اسے جواب دیتا ہے جب اس کی روح خواب اور بیداری میں اسے پریشان کرتی ہیں: "وہ اس چھوٹے سے چہرے کو ہر جگہ میرا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتا، یہ ایک ایساچہرہ ہے جو مجھے جہنم میں دھکیلنے تک پریشان کرتا رہے گا۔

شیرون

وہ نرم اور حساس ہے! وہ اپنے مبینہ وطن اسرائیل کی خدمت کرتا ہے، چاہے وہ پوری انسانیت کو روند ڈالے! وہ سرخ رنگ سے نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ خون دیکھنے سے نفرت کرتا ہے۔ لہٰذا، وہ اپنے مذموم مشغلے پر عمل نہیں کرتا، جس میں فلسطینیوں کا قتل عام کیا جارہا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ آنکھیں اور روح بند کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے مظلوموں کا خون نہ دیکھ سکے۔

غلام

وہ ایتھوپیا سے آیا تھا، اس نے ایک خوشحال زندگی کے حصول کے لیے ایک یہودی ہونے کا دعویٰ کیا، جیسا کہ صیہونی ربی نے اس سے وعدہ کیا تھا، جس نے اسے، اس کے خاندان اور اس کے ایتھوپیا کے بہت سے لوگوں کوساتھ لیا۔ شہرکے پاس انھیں صیہونی بستی میں ایک کھجور کے جھنڈ کے طور پر رہا ئش مل گئی جہاں وہ سلامتی، راحت اور اعلیٰ درجے کے انسانی سلوک کو پسند کرتے تھے۔

جبکہ اس کے ساتھی صیہونیوں نے اس کے ساتھ ایک غلام کی طرح برتاؤ کیا جو اپنے آقا سے زیادہ دور تھا انہوں نے اسے نفرت اور حقارت کی وجہ سے کچھ خوراک، اپنے خاندان کے ساتھ رہنے کے لیے ایک سیمنٹ کا ڈبہ اور ایک گھٹیا جھاڑو جس سے ادارے کو جھاڑو دیا جا سکتا تھاعنایت کیا۔ انھوں نے اپنا خادم مقرر کیا۔ اب وہ ایک حقیقی غلام ہے، فلاسہ یہودیوں کا غلام، سفید فام یہودی اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ سیاہ رنگ کا ہے اور اس کی قسمت خراب ہے۔

وہ آزادی کے لیے تڑپتا ہے، اپنی چوری شدہ خودی کو دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، اپنے بچوں کو چپکے سے ساتھ لیتا ہے، اپنے حقیقی وطن واپس چلا جاتا ہے، اور فلسطین سے دور رہتا ہے، جہاں وہ اپنی بیوی اور خاندان کے ساتھ ایتھوپیا کی سرزمین پر اترتا ہے۔ دوبارہ پرانی زندگی کی طرف لوٹتا ہے۔

کتاب

اس کی کتاب، "فلسطین میں نسلی صفائی،"سب سے مقدس چیز ہے جو اس نے فخر، دیکھ بھال اور احترام کے ساتھ مکمل کی ہے، وہ صیہونی نسل پرستوں سے جلدی اور احتیاط کے ساتھ بھاگتے ہیں جو انھیں غداری کے الزام میں پتھر مارتے ہیں، اور اسے یہ کہہ کراسے کوڑے مارو: "ایلان پاپے، غدار، عربوں کا ایجنٹ۔"

اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کیا بھگت رہا ہے، اس لیے آخر کار اس کے جرات مندانہ قلم نے اپنے لوگوں کی بربریت کا احساس کرنے کے بعد پوری سچائی اور پوری صداقت کے ساتھ لکھا۔ آخر کار وہ سکون سے جی سکتا ہے اور اطمینان سے مر سکتا ہے۔ اس نے سچ لکھا کہ اس کے صیہونی لوگ بھول جانا چاہتے ہیں۔

میوزیم

صیہونی ربی پیرس کے میوزیم آف مین کے ارد گرد گھوم رہا تھا، اور اپنے طالب علموں کوان قوموں اور لوگوں کے حالات سنارہا تھا جائزہ سنا جو ان کے قابض دشمنوں کی وحشیانہ نسل کشی کے ذریعے مکمل طور پر معدوم ہو چکی تھیں، جب بھی وہ جائزہ لینے کے سامنے کھڑا ہوتا تو اس نے خوشی سے سر ہلایا ایک قوم جو ایک گنہگار قابض کے ہاتھوں معدوم ہو گئی۔

سیرسپاٹے کے اختتام پرربی ہجوم سے پیچھے ہٹ گیا، اور ایک کوڑے دان کے قریب کھانے کے سوگ کے غم سے رونا شروع کر دیا جس پراس کے شرمیلے طالب علم نے تشویش سے پوچھا اور ربی نے اپنی آستین سے چھینٹے صاف کرتے ہوئے جواب دیا: "وہ فلسطینی ہیں جب انہوں نے ہمیں ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے، اور وہ اس میوزیم میں صرف نمائش کے لیے داخل ہوتے ہیں۔

شوق

اس ظالم صیہونی کا پسندیدہ مشغلہ فلسطینی بچوں کے سروں کو ان کے جسموں سے تیزی سے لڑھکتے دیکھنا ہے۔ وہ تمام فلسطینی کیمپوں میں اپنے مشاغل پر عمل کرتا ہے وہ ان عرب سروں کا پیچھا کرتا ہے جو صبرا اور شتیلا کیمپ میں اپنے جسم سے بھاگتے ہوئے کھیل کود میں مصروف اورچھوٹے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جب اس کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور اس کی پیاس روح جلتی ہوئی اس پر قابو پاتی ہے، تو وہ سر کے قریب آتا ہے، اپنے کلیور سے اس پر گرتا ہے، اور اسے اپنے جسم سے لڑھکنے لگتا ہے، اور وہ چپچپا، ناپاک صیہونی خون کے چشمے کو دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے ہی یہ اٹھتا ہے تو جگہ خون سے لت پت ہوجاتی ہے۔وہ لالچ، اطمینان اور خوشی سے ہنستا ہے، لیکن وہ اب بھی بخار میں ہے، ایک فلسطینی بچے کے سر کا شکار کرنے کے لیے پیاس سے جل رہا ہے!

بیج

فلسطینی بچوں کے اسکول کو مکمل طور پر تباہ کرنے میں ان کے اہم کردار کے اعتراف میں انھیں صیہونی فوج کا تمغہ برائے بہادری، تھرڈ ڈگری حاصل ہوا۔ انھوں نے اسے ایک ہیرو قرار دیا، انھوں نے اس کے نام پر اپنے کچھ نوزائیدہ بچوں کے نام رکھے صیہونی اخبارات نے اس کی تصویر کو قومی ہیرو کے طور پر شائع کیا۔

تقریبات نے اسے جلد ہی بھلا دیا، اخبارات نے اسے چھوڑ دیا، میڈیا نے اس کی طرف منہ موڑ لیا، اس کے تمغے کو اس کی میز کی دراز میں زنگ لگ گیا، اور فلسطینی بچوں کے چہرے جو اس نے ایک ہوائی میزائل سے مارے تھے، دن رات اسے ستاتے رہے۔، اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنے ناخن کھودتے رہتے تھے۔وہ ایک نہ ختم ہونے والے زمینی جہنم میں رہ رہا ہے۔

افسانہ

اپنی فوج کی انتظامیہ کی درخواست پرانتہائی سخت کورس پاس کرنے کے بعد، اسے یقین تھا کہ وہ ایک افسانوی، ناقابل تسخیر فوج کا سپاہی ہے، اس کورس نے اسے منتخب لوگوں اور ناقابل تسخیر فوج کا ایک اہلکار بنادیا تھا۔ اب وہ تمام عربوں اور یہاں تک کہ پوری دنیا کو کچلنے کے لیے مقرر کردہ کسی بھی مشن پر نکلنے کے لیے تیار ہے جب تک کہ وہ اس عظیم فوج میں سپاہی ہے۔

اس کا پہلا مشن لبنان میں فلسطینی گوریلوں کو کچلنا تھا جس رات اسے اپنے مشن پر مامور کیا گیا، اس نے بہت زیادہ شراب پی، اور ایک صیہونی طوائف کے پاس رہا جو ان کے ساتھ فوج میں کام کرتی تھی۔ اس خوشی بھری جنگ میں اسے کسی خاص قسم کی محنت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی،اس کا خیال تھا کہ اسے فتح حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، وہ فلسطینیوں کے قتل وغارت کے بعد شراب وکباب کی محفل جاری رکھنے کے لیے اپنی رہائش گاہ پر واپس آجاتا ہے۔

آخر کار، وہ اپنے وعدے کے مطابق باہر نکلا، وہ کسی بھی گوریلا آدمی سے نہیں ملا تھا، جنہوں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی فوج بڑوں کو ان کے لیے بلانے کے قابل نہیں تھی۔ انہوں نے اس پر اور اس کے گروپ پر آر پی جی گولوں کی بارش کردی، چند ہی منٹوں میں وہ چھوٹے ٹائٹنز کے ہاتھوں اسیر

سپاہی بن گئے جیسا کہ اس نے تصور کیا تھا، بلکہ اس کی پتلون اتارلی گئی،انھوں نے اسے اپنے ہتھیاروں سے لیس کیا، لہٰذا اس نے اپنے پیروں کو ہوا کی طرف چھوڑ دیا جس نے اس کی برہنگی کا مذاق اڑایا، اور وہ فرار کی راہ پر اس امید پر چل پڑا کہ وہ ان دھوکے بازوں کے پاس زندہ لوٹ آئے گا جنھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ایک افسانوی سپاہی ہے۔ ان کے چہروں پر تھوکنے کے لیے۔

بھولنے کی بیماری

انھوں نے نصف صدی سے زیادہ پہلے اسے صیہونیت کے اصول سکھاتے ہوئے کہا تھا: "بوڑھے فلسطینی مر جائیں گے، اور ان کے جوان بھول جائیں گے۔"

وہ ننھے فلسطینیوں کے چہرے دکھاتا تھا، اور اس نے صیہونی فوجیوں کو سنگسار کرنے کی سزا کے طور پر انھیں قید کرنے کا حکم دیا، اس نے بچوں پر لعنت بھیجی اور ان کے چہروں پر تھوک دیا جب تک کہ اس کا تھوک خشک نہ ہو گیا، اس نے ان کے جانے کے بعد دروازہ مارا اور بچوں کو زنجیروں سے باندھ کر جیل کی طرف لے جایا گیا ان کی پکارنے آسمان کو ہلا کر رکھ دیا، وہ ان پرڈھائے جانے والے عذابوں سے خوش ہوا، وہ بہت خوش ہوا، پھر اس نے زور سے رونا شروع کر دیا۔ اپنے بڑے بڑے آنسو گراتے ہوئے کہا: "وہ نہیں بھولیں گے۔"

خوشبودار پودا

وہ ایک قدیم یروشلم کے گھر کی دوسری منزل پر رہتی ہے جسے صیہونی قبضے نے اس کے خاندان سے چھین لیا تھا، اور وہ اس کا، اس کے شوہر اور اس کی بیٹی کی ملکیت تھا جس کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی۔ نچلی منزل پر رہنے والے یروشلم کے خاندان کو پریشان کرنے کے لیے انھیں جانے پر مجبور کیاگیا، لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی کیونکہ اس کی نفسیاتی طبیعت کے باعث اس کے شوہر اور اس کے گھر والے اس سے نفرت کرتے تھے، جو اسے مسلسل اچھی خوبیوں کو ترک کرنے پر زور دیتے رہتے تھے۔

اس نے اپنے ہاتھ گھر کے مالک کے ایک خوشبودار پودے کے بیسن پر رکھے، جو اس نے قاتل مقدس گھر کی دوسری منزل پر قبضے میں لیے تھے، اسے یہ خوشبودار پودا بہت پسند تھا، جس کی خوشبو خوشگوار تھی۔ نرم خوشبو، لیکن پودا مسلسل مرجھا رہا ہے جب سے اس نے اس پر قابو پالیا ہے۔

اس نے اندازہ لگایا کہ پودا اپنے لوگوں سے پیار کرتا ہے، اور یہ کہ اس پودے کوبھی یروشلم کی مالکن کی کمی محسوس ہوئی جس نے اسے لگایا تھا اور اس کی دیکھ بھال کی تھی۔مالکن نے اسے گھر کی سیڑھیوں سے نیچے لگایا تھا۔ اپنی بیٹیوں میں سے ایک کے بالوں کوگوندھتے ہوئے اس نے خوشبودار پودے کا بیسن اپنے سامنے رکھا، اور اسے تقریباً فلسطینی بولی میں کہا: "یہ پودا تمھیں چاہتا ہے۔"

یروشلم کی عورت نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا: "یہ عام بات ہے کہ درخت اپنے لوگوں کو جانتے ہیں اور اجنبیوں کو مسترد کرتے ہیں۔"

طالب علم

اس کے استاد کا راز.....اور یہ اس کا سب سے بڑا موقع ہے کہ وہ اس کے راستے پر چلتے ہوئے اس کا وفادار طالب علم بن جائے، وہ ضرور ہے جس نے اسے سکھایا کہ سائنسی تحقیق اور میدانی تعلیم دو مقاصد ہیں جو ہر طرح کی اجازت دیتے ہیں، چاہے وہ انسانی ہوں یا سفاکانہ، اور انھیں کسی بھی اخلاقیات پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے اس کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ زندہ رہتے ہوئے ایک فلسطینی قیدی کی لاش کے ٹکڑے کر دے۔ کیونکہ وہ انھیں دکھانا چاہتا ہے کہ اہم اعضاء کیسے کام کرتے ہیں اور ان کا مالک زندہ ہے۔

جب وہ فلسطینی قیدیوں کی لاشوں پرتحقیقی اسباق میں سے پہلی درسگاہ میں شریک ہوا تو وہ بے ہوش ہو گیا، اوراسے جوکچھ یاد رہا وہ قیدی کے سینے میں چھلکے کا گھسنا اور اس کی چیخیں، درد کی شدت کی وجہ اس کی آواز کی ہڈیوں کو پھاڑنا تھا۔ اس کے بعد، وہ چیچپا اورایک لمبے کوما میں چلا گیا یہاں تک کہ اس کے استاد، صیہونی ڈاکٹر نے اسے ایک تھپڑ سے جگایا جس سے اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔

اس تھپڑ کے بعد وہ کبھی بیہوش نہیں ہوا اور وہ اپنے ڈاکٹر استاد کے پیچھے چلتا رہا، فلسطینی قیدیوں کے جسموں پر تباہی مچاتا۔اس کے بعد اسے انسانی درد کی کوئی پرواہ نہیں رہی اور وہ ہمیشہ اس کی تمنا کرتا رہا۔ اپنے استاد کے جسم

سے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ طالب علم شیطان کے کام میں اپنے استاد سے آگے نکل سکتا ہے۔

اب وہ اس مزے کو حاصل کرے گا جس کا وہ خواب دیکھتا ہے، جیسا کہ اس کے پاس سنہری پلیٹ میں انتظار کا موقع آیا تھا۔ اس کے سامنے اس کا استاد حرکات و سکنات سے مفلوج پڑاہے، اور وہ ایک نایاب بیماری میں مبتلا ہے جو دریافت کیے جانے کی مستحق ہے، اور وہ اس اسپتال میں اس کا ذمہ دار ہے، اس لیے وہ بغیر ایک لفظ کہے یا بغیر کسی توقف کے اس میں اپنا سکیل پل چلا سکتا ہے۔ اس نے ایک آہ بھری، چاہے وہ درد سے معذور ہو جائے، وہ اس موقع کو کبھی ضائع نہیں کرے گا، وہ چابی جیب میں رکھتا ہے، اور اس میں سے گزرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے استاد کا جسم، اس کی گردن سے شروع ہوتا ہے جب تک کہ larynx ظاہر نہ ہو، اس کے پیٹ کے نیچے تک سیدھی لکیر میں اترتا ہے۔

أوزون

وہ سب جمع ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ انھوں نے فلسطینیوں کو تمام آفات، فتنوں اور مصیبتوں میں قربانی کا بکرا بنایااورانھیں ہی موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ ایک ہی سیشن میں تمام برائیاں ان کی طرف منسوب کر دی گئیں: یہ وہی ہیں جنھوں نے دنیا کو خراب کیا، بے شمار خزانے چرائے، امن سے لڑے، روئے زمین پر بیماریاں، دکھ، سانحات اور آفات پھیلائیں، اور ماضی وحال کے شعلے بھڑکائے اور مستقبل کی عالمی جنگیں، وہ ہر جگہ تنازعات اور دشمنی کا سبب ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے موت کو انسانوں سے زیادہ اہمیت دی، اسی لیے انھیں تشدد کا نشانہ بنایا، مارا گیا اور بے گھر ہونا پڑا۔

فلسطینیوں سے منسوب جرائم کی فہرست کے آخر میں، چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ، اور جو ابھی تک پراسرارطورپرلاپتہ ہیں، کچھ بھی نہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اوزون کی خلاف ورزی کی وجہ بتانے سے قاصر ہیں، جس کی قیمت انسانیت کو بھگتنی پڑے گی۔

اس کائناتی سربراہی اجلاس میں سب سے جھوٹا شخص کائنات کے جرائم کو فلسطینیوں سے منسوب کرنے کے لیے مسکرایا، اس نے ایک کھوکھلی، بدبودار سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے اس کے سر پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس نے خوشی اور اطمینان کے ساتھ کہا: "یہ ایک آسان اورسب سے آسان

جرم ہے کہ فلسطینی ہی وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے لاپروائی سے اوزون کی تہہ کی خلاف ورزی کی۔

عالمی مجمعے نے اس تجویز پر خوشی اور راحت کے ساتھ اظہار کیا، اوروہ سب اس خطرناک ماحولیاتی الزام کو۔ اگر یہ سچ تھا۔ ان "جھگڑالو"فلسطینیوں کو دینے پر متفق ہوئے اوراس کے کے حق میں ووٹ دیا جنھوں نے اپنے ہاتھ کی ہر چیز کو خراب کیا، یہاں تک کہ ان کی چھیڑ چھاڑ کا دائرہ بڑھایا گیا۔ اوزون کی ناقص تہہ، تو انھوں نے اسے پنکچر کر دیا۔

پردیسی کے نغمات

بت

پہلا فلسطینی جسے خدا نے انسانی تاریخ کے آغاز میں تخلیق کیا، وہ ہنرمنداوربے مثال تھا، اس نے اپنے وطن کی خوبصورتی کی تصویر میں اپنے مجسمے بنائے۔

ایک دن اور ایک رات، ایک یہودی غاصب آیا، اس کے وطن کو چرا لیا، اس کے مجسموں کو توڑ ڈالا، اور اسے اس کے بہت سے بیٹوں سمیت وہاں سے نکال دیا، جو سب اس کی طرح ہنر مند نمونے تھے۔

سب سے پہلے قدیم فلسطینی اپنے وطن واپس آنے کے انتظار میں دربدررہے اور ان سب نے اپنے وطن فلسطین سے مشابہ مجسمے بنائے۔ فلسطین کی مثال تاکہ وہ اسے کبھی نہ بھولیں۔ چنانچہ وہ جہاں بھی گئے اسے ساتھ لے گئے۔

ایک طویل عرصے کے بعد غاصب یہودی کو وہاں سے نکالنے کے بعد پہلا فلسطینی اور اس کے بیٹے اپنے وطن فلسطین واپس آئے تاہم فلسطینیوں کی یہ عادت رہی کہ وہ زمین کو آباد کریں اور اپنی طرز پر جگہیں اور ملک بنائیں۔ فلسطینیوں کی تاریخ وطن چھوڑنے، وطن واپس آنے،اسے تعمیر کرنے اور وطن واپس لوٹنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہوا اور کتے

وہ بہت بڑی تعداد میں فلسطینیوں کو قتل کرنے، ان کے جسموں کو مسخ کرنے، ان کی کھوپڑیوں کو جلانے، ان کی ہڈیوں کو زمین پر گرانے اور ان کی راکھ کو ہوا میں بکھیرنے میں کامیاب ہوئے تاکہ وہ اس عفریت سے نجات حاصل کر سکیں جسے "فلسطینی عوام کی وطن واپسی" کا نام دیا جاتا ہے۔

ظالم صیہونیوں کی آوازیں بلند ہوئیں، شہوت بھری خوشی کے ساتھ وہ کہنے لگے: "ہم اسرائیل ہیں اور فلسطینی کچھ بھی نہیں رہے"۔

ہوا نے ان کی بھونکنے والی آوازوں کا مذاق اڑایا، فلسطینیوں کی راکھ جوہوا کے جھونکوں سے بکھری ہوئی تھی اٹھائی اورفضا میں ہمیشہ کے لیے امرکردیا، چنانچہ فلسطینی ایک بار پھر زندہ ہو گئے اورایک ایسے روپ سے اترے جو کبھی نہیں مرتا۔ وہ سب ایک تیز مسکراہٹ لیے ہوئے تھے، اسے تیز ہوا کی طرف لہرا رہے تھے جو انہیں بھیج رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ کتوں کے بھونکنے پر یقین نہیں رکھتی، خواہ کتنی ہی اونچی آواز میں ہو!

درانتی

کسان فلسطینی درانتی لے کر زمین پر اترا،کیونکہ اس کی درانتی کو صرف فلسطینی زمین سے پیار تھا جس کے خزانے اس نے اپنی خواہش اور اطمینان سے حاصل کیے تھے۔

صیہونی اجنبی زمین کو اس سے محبت کرنے کے لیے چوری کرنے آئے تھے، اس لیے اس نے خون کو اپنے لیے پینے کے لیے ان کی گردنوں کے خون سے پیار کیا جسے اس نے نفرت اور بیزاری سے کاٹا۔

فلسطینی درانتی کی طاقت سے بچنے والے اجنبیوں کے چلے جانے کے بعد، درانتی ایک بار پھر لوٹ آئی، خود کو زمین کی محبت کے لیے وقف کر دیا، اور پیار کرنے والے کسانوں کے ہاتھوں میں گانا گایا۔

ویہم

انھوں نے زمین کو چرا لیا، اس کے مالکوں کو بے گھر اوربے دخل کیااوراسے اسرائیل کہا، تو یہ زمین ان حملہ آوروں کے خلاف کمربستہ ہوگئی اوران سے محبت کرنے لگی۔ جنھوں نے اسے کاشت کرنے کے لیے ہزاروں سال تک اسے تقسیم کیا، یہ ان کی خصوصیات، ان کی آوازوں اوران کی خوشبو کے ساتھ ان ظالموں کے خلاف سراٹھا کرکھڑی ہو گئی۔ اس نے فلسطینی فدائین کو اپنی ماں فلسطین کی خصوصیات کے ساتھ جنم دیا اور پھر اس کا نام فلسطین رکھا گیا اور یہ اپنے آسمانی، لافانی نام کا نعرہ لگاتی رہی۔

قیامت

انسانیت پر دوسری ضرب لگائی جاتی ہے اورایک خطے کی پوری آبادی کوباہر دھکیل دیا جاتا ہے، انسان اپنی مرضی سے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک عظیم مجمع میں موجود ہیں، فلسطینیوں کے علاوہ ہر کوئی اپنے اپنے اعمال اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے ہے جبکہ وہ فلسطین کو اپنے سروں پر اٹھائے ہوئے ہیں ___اپنے رب کے سامنے___ اپنے لیے ___اپنے خاندانوں کے لیے___ اور ان تمام لوگوں کے لیے جنھوں نے اس کے لیے قربانی دی___ شفاعت کرنے کے لیے کھڑے ہیں۔

اسے یروشلم میں وہ آدمی نہیں ملا جس سے اس نے شادی کرنے کا خواب دیکھا تھااس لیے اسے اپنے شہر سے باہر تلاش کرنے کے لیے، اسے اپنی مستقل رہائش کی شناخت کو خطرے میں ڈالنا پڑا، جس کی وجہ سے اسے شہر میں رہنے کی اجازت ہے۔ صیہونیوں کی طرف سے یروشلم شہر کے عربوں پر عائد پابندیاں انھیں ایک بڑی جیل میں رہنے پر مجبور کر رہی ہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ دیں تو واپس نہیں جا سکتے اور اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے تو اس شہر سے باہر مغربی کنارے یا فلسطین سے باہر۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ یروشلم میں اپنی مستقل رہائش کی شناخت ہمیشہ کے لیے کھو دے گی۔

عرب دارالحکومتوں میں سے چند دوروں میں سے ایک کے دوران، اسے عرب قومیت کے ایک فلسطینی سے پیار ہو گیا، لیکن اس نے اس کے لیے اپنی محبت قربان کر دی تاکہ وہ واپس یروشلم شہر پہنچ جائے، اور وہاں اپنی رہائش سے محروم نہ ہو۔ اگر ان کی شادی ہو جائے تو اس کے لیے شناختی کارڈ یا اس کے شہر میں مستقل رہائش کا اجازت نامہ حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

لیکن تارکین وطن میں رہنے والا وہ نوجوان فلسطینی اس کی زندگی کی پہلی اور آخری محبت تھی، لیکن یروشلم شہر کے لیے اس کی فطری محبت نے اس کے دور دراز، ڈائاسپورا کے عاشق کے لیے اس کی ابدی انسانی محبت پر فتح حاصل کرلی۔

مگرشادی سے انکارپروہ مایوس ہو کر اپنے راستے پر چلا گیا اور راستے اسے اس سے دور کر گئے، جیسے برسوں نے اس کی جوانی، امیدیں اورخواب چرا لیے ہوں، لیکن کوئی بھی اس سے اس شہر کی محبت کو چھین نہ سکا۔ یروشلم کی، جس سے وہ دور نہیں رہ سکتی، چاہے وہ اس کے خوابوں کی تعبیرہوجو اس کے ساتھ محبت میں گرفتارہو گئی ہو۔ لاٹ صیہونیوں کی بمباری ایک ماہ سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے۔ وہ اور اس کے بچے رمضان کے بابرکت مہینے میں اسی طرح بھوکے ہیں جس طرح غزہ کے سبھی لوگ اس بمباری سے بھوکے ہیں جو ان کا محاصرہ کر رہی ہے۔ چند لمحے پہلے اس کے پاس یہ موقع ہے کہ وہ اپنے چار بچوں کو کھانا

کھلانے کے لیے باہر جائے کیونکہ اس کا شوہربھی اسے چھوڑ کر جاچکا ہے۔

اس کا بڑا بیٹا، جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں ہے، مطلوبہ خوراک خریدنے کے لیے خود باہر جانے کے لیے پُرعزم ہے کیونکہ جنگ بندی کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کی موت اس کے بھائیوں کے لیے اپنی ماں کو کھونے سے کم مصیبت ہے۔

ان کے درمیان کافی دیر تک بحث ہوتی رہتی ہے، آخر وہ اس بات پر راضی ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چھوٹے سے مربع کاغذ پر اپنا نام لکھتا ہے، اور وہ دونوں کاغذات کچن میں پھینک دیتے ہیں کہ جس کا نام قرعہ نکل آیا وہ کھانا لینے جائے گا۔ ان دونوں کاغذوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے بعد، ماں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں کے سامنے جس کاغذپربیٹے کا نام لکھا ہوا تھااسے پھاڑا اور اپنی جیب میں ڈال لیا اور اپنے بچوں سے سختی سے کہتی ہے: "ہم میں سے کسی کو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس ابھی بھی کچھ پیسی ہوئی دال موجود ہے۔ ہم ایک مزیدار دال کا سوپ کیسے بنائیں؟"

محبت کی کہانی

وہ اس سے پیار کرتا ہے اور وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ دونوں اپنے بچپن سے ہی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں، اس لیے انھوں نے اپنی باقی زندگی ایک دوسرے

کے ساتھ رہنے کا عہد کیا، اور انھوں نے اپنے عہد کو زیتون کے کھیت میں زیتون کے درخت کے تنے پر جو اس کے خاندان کی صدیوں سے ملکیت میں ہے۔

یہ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ وہ اگلے موسم خزاں میں شادی کریں گے، لیکن صیہونی دشمن نے متوقع زوال آنے سے پہلے ہی ان کی زمین پر قبضہ کر لیا، ان کے زیتون کے درختوں کو اکھاڑ پھینکنے کے بعد انھیں بلڈوز کر دیا، اور پھر اس پر کئی ٹن سیمنٹ ڈال دیا تاکہ صیہونی بستیوں کی بنیاد کا کام کیا جا سکے۔

لوگوں نے دو محبت کرنے والوں کے گھروں کودھماکہ خیزمواد سے اڑادیااوراس محبت کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیا اوران کی خاک کو اس مقدس سرزمین پر بکھیر دیا، ان دونوں نے اپنی محبت مقدس سرزمین پر قربان کردی۔

دو فٹ

مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور اس کے انہدام کی تیاری کے دوران جب کھدائی کی گئی تو طلبہ نے مقدس سرزمین کے بچاؤ کی خاطر دھرنا دے دیا۔ نجاح یونیورسٹی میں جانے کی وجہ سے اس نے اپنی آزادی، اپنی نقل و حرکت کی صلاحیت اور اپنی کزن (بہیا) سے شادی کرنے کا خواب بھی کھو دیا، جس سے وہ بچپن سے محبت کرتا تھا، اور اس نے خود اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا___مہربانی___ لیکن اس نے اپنے کسی نقصان کی پرواہ نہیں کی۔

اس نے زیتون کی لکڑی سے اپنے لیے دو پاؤں بنانے میں مہینوں گزارے، اور جب اس نے انہیں بنانا ختم کیا، تو وہ خوشی سے ان پر سوار ہوا اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کے خلاف احتجج اور دھرنے میں شرکت کے لیے وہ اپنی نئی نئی بیساکھیوں پر چل کر مسجد اقصیٰ پہنچ گیا تاکہ وہ صیہونی دشمن کا مقابلہ کرسکے۔

خیالی فلم

ان میں سے پانچوں نے ٹیلی ویژن اسکرین کے سامنے ایک ایسی فلم دیکھی جس پر وہ صرف غور کر سکتے تھے، اپنے بچپن کے رواج اور اپنی محرومیوں کی زبان کو ایک افسانوی فلم کے طور پر دیکھا عید پر کپڑے پہننا، بحفاظت اسکول جانا، اور گھروں کی بالکونیوں میں رکھے ہوئے لکڑی کے احتیاط سے بنے ہوئے پنجروں میں خوبصورت گانے والے پرندے پالنا۔

انہوں نے دیکھا کہ باپ خوش اور فعال کام پر جاتے ہیں، اور شام کو کینڈی، امید، نوٹوں اور رات کی کہانیوں سے لدی گھر لوٹتے ہیں۔

انہوں نے ماؤں کو خوشی کے گیت گاتے ہوئے کھانا تیار کرتے دیکھا، اور انہوں نے کسی شہید باپ، کسی گرفتار بھائی یا ستائے ہوئے باپ کا ماتم نہیں کیا۔ یہ ایک آرام دہ زندگی تھی جس کا وہ اپنے وطن فلسطین میں نہیں جانتے تھے۔

چھوٹے بچے نے افسانوی فلم دیکھنے کی خوشی سے خود کو چھیننے کی ہمت کی، اور اپنی ماں سے ملامت کے اظہار کے ساتھ پوچھا: "ماں، ہم ان بچوں کی طرح خوبصورت زندگی کیوں نہیں گزارتے؟"!

ماں نے مہرور کی آہ و زاری میں پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنے آپ کو ایک ٹھوس، سخت انسان کا روپ دھارنے کے لیے

جھکایا اور اس سے کہا: "کیونکہ ہم فلسطین میں رہتے ہیں اور صہیونی دشمن فلسطینی بچوں سے نفرت کرتا ہے۔''

بچے نے پھر حیرت سے اپنی ماں سے پوچھا: ماں، صہیونی دشمن فلسطینی بچوں سے نفرت کیوں کرتا ہے؟

فلسطینی ماں نے آہ بھری، غم پر دکھ اٹھائے، اپنے گھٹنے ٹیک دیے، اپنے بچے کو ان پر بٹھایا، اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس سے کہا: ”کیونکہ تم ہی ہماری امید ہو اور فلسطین کی آزادی کی امید ہو۔ جو تم بڑے ہو کر ہمارے وطن سے بے دخل ہو جائینگے۔

ڈاکٹر سناء شعلان (بنت نعیمہ) مختصراً:

ڈاکٹر سناء شعلان (بنت نعیمہ)، جنہیں عربی ادب کا سورج، عربی افسانے کی خاتون، اور عربی ادب کی علامت کا نام دیا جاتا ہے، ایک اردنی مصنفہ، علمی، اور فلسطینی نژاد میڈیا کی شخصیت ہے، اسکرپٹ رائٹر ، پریس نامہ نگار، انسانی حقوق، خواتین، بچوں اور سماجی انصاف کے مسائل میں ایک کارکن کے طور پر انہوں نے اردن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ادب اور ادبی تنقید میں امتیاز کے ساتھ وہ بہت سے ادبی، علمی اور میڈیا فورمز کے ساتھ ساتھ مقامی، عرب اور بین الاقوامی تحقیقی اور قانونی اداروں کی رکن بھی ہیں.

وہ ناولوں، مختصر کہانیوں، بچوں کے ادب، سائنسی تحقیق، تھیٹر، سفری ادب، تقابلی ادب اور میڈیا کے شعبوں میں تقریباً 66 بین الاقوامی، عرب، مقامی اور علاقائی ایوارڈز جیت چکی ہیں.

ان کی 75 شائع شدہ کتابیں ہیں، جن میں ایک خصوصی تنقیدی کتاب، ایک ناول، ایک مختصر کہانیوں کا مجموعہ، بچوں کی کہانیاں، ایک تھیٹر اسکرپٹ، اور ایک سفر نامہ شامل ہیں، جن میں سیکڑوں مخطوطات کا ایک بڑا حصہ ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ شائع شدہ مواد میں مطالعات، مضامین، اور تحقیق کے علاوہ بہت سے مقامی، عرب، اور بین الاقوامی اخبارات اور رسالوں اور سیریز اور فلموں کے اسکرپٹ شامل ہیں.

ان کی سائنسی، ثالثی اور میڈیا کمیٹیوں میں رکنیت کے علاوہ ادب، تنقید، انسانی حقوق، ماحولیات، سماجی انصاف، عرب ورثہ، انسانی تہذیب اور تقابلی ادب کے مسائل پر مقامی، عرب اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھرپور شرکت ہے.

وہ بہت سے ثقافتی اور قانونی اداروں کی نمائندگی کرتی ہیں اور بہت سے عرب اور بین الاقوامی ثقافتی اور فکری منصوبوں میں شراکت دار بھی ہیں.

ان کی تصنیفات کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور انہوں نے بہت سے اعزازات، شیلڈز، اعزازی ٹائٹلز، اور ثقافتی، سماجی اور قانونی نمائندگیاں حاصل کی ہیں.

ان کا تخلیقی پروجیکٹ اردن، عرب دنیا اور باقی دنیا میں بہت سے تنقیدی اور تحقیقی مطالعات، ماسٹرز اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں کا میدان ہے.

مصنف سے رابطہ کرنے کے لیے: ڈاکٹر سناء شعلان (بنت نعیمہ)

الأردن- عمان- الرّمز البريدي: 11942

ص. ب: 13186

خلوي وواتس وفايبر: 00962795336609

البريد الإلكترونيّ: selenapollo@hotmail.com

Facebook: sanaa shalan

(سناء الشعلان) Youtube: sanaa shalan

ڈاکٹر: لبنیٰ فرح:

آپ مکہ مکرمہ سعودی عرب میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔کچھ عرصہ بعد پاکستان منتقل ہو گئیں۔ یہاں آپ نے NUMLسے عربی کی ڈاریکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوئیں بعد میں آپ نےNUML میں شمولیت اختیارکیاور آپ نےNUML کے شعبہ عربی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسرخدما ت سر انجام دے رہی ہیں۔آپ صرف عربی زبان کی بہتری مُدرسہہیں بلکہ آپ کو ترجمہ کاری میں بھی خصوصی مہارت حاصل ہے آپ کی اس شعبہ میں مہارت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاستا ہے کہ آپ اس شعبہ میں نہ صرف چھ کتابوں کی مصنفہ ہیں بلکہ آپ نے مختلف سفارتی مشنزکے ساتھ مترجم کے فرائص بھی سر انجام دیے ہیں جس میں صدارتی سطح ملک کے اعلیٰ سطحی مشنز شامل ہیں۔آپ کی زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ

کی ایک کڑی ہے۔یہ مختصر کہانیوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے اور یہ تمام کہانیاں فلسطین سے متعلق ہیں جس میں فلسطین کے درد کو بہت ہی احسن اور منفرد انداز سے اجاگر کیا گیا ہے ان میں نہ صرف فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وجبر کو دنیا کے سامنے لایا گیا ہے بلکہ اسرائیل کی بربریت کو بھی خوب نمایاں کیا گیا ہے۔آپ نے ان کہانیوں میں صرف اہل فلسطین اور ظالم یہود کو عنوان ہی نہیں بنایا ہے بلکہ آپ نے باقی دنیا بالخصوص اہل مغرب کی منافقت کا بھی خوب پردہ چاک کیا ہے جیسا کہ اس کتاب کی سب سے پہلی کہانی ہی اس بات کی خوب تمازی کرتی ہے کہ کس طرح مکار یہودی ظالم ہو کر بھی مظلومیت کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے مغربی حامی نہ صرف انکی حرکتوں پر خاموش ہیں بلکہ ڈھٹائی کے ساتھ نہ صرف ان کے ہم نوائی میں مصروف ہیں بلکہ کھلم کھلاانکی حمایت اور مدد میں مصروف ہیں۔آپ نے ان کہانیوں میں نہ صرف حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے بلکہ آپ نے جذبات و احساسات کی بھی ایسی درست ترجمانی کی ہے کہ قاری خودکو فلسطین کا حصہ سمجھنے پر مجبورہو جاتا ہے اور کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے نہیں روک پاتا ہے اور دراصل یہی ایک لکھاری کا اپنے قاری پر گرفت کا منہ بولتاثبوت ہوتا ہے یعنی قاری لکھاری کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پاتا ہے وہ وہی سوچتا ہے جو لکھاری چاہتا ہے حتیٰ کہ اسکی مسکراہٹ اور غمگینی،شگفتگی اور افسردگی چہرے کی

کھلکھلاہٹ اور آنکھوں کی تمناکی تک لکھاری کے الفاظ قبضہ کر لیتے ہیں اور وہ انکے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔آپ کی مختصر کہانیوں کی یہ کتا ب ان اوصاف سے پوری طرح مزین ہے اور اس بے حسی کے دور میں اہل فلسطین کے حق میں ایک توانا آواز ہے جو دنیا کو خاص طورپرنوجوان نسل کو جو کہ اب سوشل میڈیا زیر اثر ہے جس پر اہل یہود کا ہی قبضہ ہے اہل فلسطین کی حالت زار مظلومیت اور بے بسی سے آگاہ کر رہی ہے بلکہ ظالم قوتوں کیلئے بھی ایک تازیانے کا کام کررہی ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے مقبول عام فرمائے.(آمین)

ڈاکٹر: سناء شعلان

ڈاکٹر: لبنیٰ فرح

9 789957 545765
Sanaa Kamel Shalan

ALTNOOR
النور
Culture and Art للثقافة والفنون